محمد عاصم بٹ کے ناولوں "دائرہ" اور "بھید" میں لاہور بطور پس منظر

تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار

حافظ محمد افضل

فیکلٹی آف لینگوئجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

محمد عاصم بٹ کے ناولوں "دائرہ" اور "بھید" میں لاہور بطور پس منظر

تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار

حافظ محمد افضل

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو ئجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: محمد عاصم بٹ کے ناولوں "دائرہ" اور "بھید" میں لاہور بطور پس منظر تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: حافظ محمد افضل رجسٹریشن نمبر: 1572/M/U/F18

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر نازیہ یونس _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود _____

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم _____

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: _____

اقرارنامہ

میں، حافظ محمد افضل، حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نازیہ یونس کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

حافظ محمد افضل

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

فہرست ابواب

مقالہ اور دفاع مقالہ کی منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	vi
فہرست ابواب	v
Abstract	ix
اظہارِ تشکر	x
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث	1 تا 22
(الف) تمہید	1
i۔ موضوع کا تعارف	1
ii۔ بیانِ مسئلہ	1
iii۔ مقاصدِ تحقیق	2
iv۔ تحقیقی سوالات	2
v۔ نظری دائرہ کار	2
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	3
vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	3
Viii۔ تحدید	3

ix۔ پس منظری مطالعہ 4
x۔ تحقیق کی اہمیت 4
(ب) محمد عاصم بٹ کا تعارف وحالاتِ زندگی 5
(ج) دیگر مشاغل 9
(د) ادبی سرگرمیاں، تصانیف، اعزازات 10
حوالہ جات 13
باب دوم: ثقافت اور شہر لاہور کی مخصوص ثقافت تجزیاتی مطالعہ 14 تا33
(الف) لاہور شہر کا تعارف 14
(ب) کلچر کی تعریف 17
(ج) لاہور شہر کا مخصوص کلچر 21
حوالہ جات 33
باب سوم: محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں لاہور شہر کے مقامات: تجزیاتی مطالعہ 35 تا82
(الف) ناول "دائرہ" میں لاہور شہر کے مقامات 35
(ب) ناول "بھید" میں لاہور شہر کے مقامات 64
(ج) مجوزہ ناولوں میں لاہور کے ماحول کی پیش کش کے اختلاف وامتیازات 77
حوالہ جات 85
باب چہارم: محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں لاہور شہر کے کردار: تجزیاتی مطالعہ 87 تا132

(الف) ناول "دائرہ" میں لاہور شہر کے کردار 87

(ب) ناول "بھید" میں لاہور شہر کے کردار 106

(ج) دونوں ناولوں میں لاہور شہر کے باسی کرداروں کا تقابلی مطالعہ 126

حوالہ جات 132

باب پنجم: مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج، سفارشات 135تا144

(الف) مجموعی جائزہ 135

(ب) نتائج 142

(ج) سفارشات 143

(د) کتابیات 144

(ح) ضمیمہ 147

Abstract:

This qualitative research set out to examine analytically the locality of Lahore, its background and culture in the novels of famous writer Asim Butt. “DAIRA” and “BHIAD” both novels have been selected for this purpose, as both novels represents the original culture, tradition of “Androne Lahore” . The writer has beautifully presented the psychological aspect of this city as well as its demographic variations. For this study analytical methodology has been adopted to present the cultural background of the different strata of the people who lived in this famous city of Punjab province by the writer of these novels. In this study different traits and psychological background of the people of Lahore has been analyzed through the characters of the novels. The study revealed that the writer has presented the culture and background of the people of Lahore realistically. The writer has described the Historical places, local tradition, and its tradition artistically. Characters of these novels presented the original picture of that society, and their psychological state of mind has been changed during action of novels. Characters are dynamic and belong to every strata of the society. Finally, Asim Butt has given the taste of historical Lahore with language and landscape used in these novels.

اظہارِ تشکر

میں اس مقالے کی تکمیل پہ خدائے بزرگ و برتر کا شکر گزار ہوں جس نے مجھ ناچیز کو یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا کی۔ میں بالخصوص اپنی نگران کار ڈاکٹر نازیہ یونس کا احسان مند ہوں جنہوں نے نہ صرف ہر لمحے پر میری راہنمائی فرمائی بلکہ میری خامیوں اور کوتاہیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کام کی تکمیل کے لیے مسلسل میری حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ میں سابقہ و موجودہ صدور شعبہ اردو ڈاکٹر روبینہ شہناز اور ڈاکٹر عابد سیال صاحب اور کو آرڈینیٹر ڈاکٹر فوزیہ اسلم کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جن کی شفقت اور رہنمائی میرے شاملِ حال رہی۔ میں شعبہ اردو کے تمام معزز اساتذہ کرام بالخصوص ڈاکٹر شفیق انجم کا بھی ممنون ہوں جن کے دیے گئے علم اور تربیت کے سبب میرے لیے اس تحقیقی کام کو سرانجام دینا ممکن ہوا۔

اپنے والد محترم اور اپنے چھوٹے بہن بھائی کی محبتوں اور حوصلہ افزائی کا ذکر کرنا بھی یہاں بے جا نہیں جن کی دعائیں ہمیشہ میری ہمت بڑھاتی اور میرے ارادوں کو مہمیز دیتی رہی ہیں۔ میں یہاں محترم جناب اللہ رکھا کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر میری ہر ممکنہ مرحلے میں رہنمائی کی اور محترمہ شائستہ افضل کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے مقالے کی پروف ریڈنگ کر کے اس کو ممکنہ اغلاط سے پاک کیا اور مواد کی فراہمی میں میری مدد کی۔ میں محترم محمد رفیع کا بھی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں اپنا وقت مجھے دیا۔ میں اپنے تمام ساتھی سکالرز بالخصوص حافظ محمد ثاقب نیاز اور عبداللہ ہارون کا بھی شکر گزار ہوں جو وقتاً فوقتاً تحقیقی امور میں میری رہنمائی کرتے رہے۔

حافظ محمد افضل

باب اول:

موضوعِ تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث

(الف)۔ تمہید:

ا۔ موضوع کا تعارف:

اس مقالے کا مجوزہ موضوع "محمد عاصم بٹ کے ناولوں "دائرہ" اور "بھید" میں لاہور بطور پس منظر تجزیاتی مطالعہ " ہے۔ یہ موضوع ان کے دونوں ناولوں میں پیش کیے جانے والے مقامات اور کرداروں کے حوالے سے ہے۔ناول میں زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔اردو ادب میں اسی وضع کے کئی ناول منظر عام پر آ چکے ہیں لیکن لاہور کی اندرونی زندگی اور مقامات کی وہ تصویریں محمد عاصم بٹ نے منفرد انداز میں پیش کی ہیں۔ محمد عاصم بٹ موجودہ دور کے ناول نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔عاصم بٹ کے فنی سفر کا آغاز نوے کی دہائی میں ہوا۔ آپ دورِ جدید کے اہم قلم کار ہیں اور ان کی کہانیاں عصری موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں " اشتہاری آدمی اور دوسری کہانیاں "اور " دستک " شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے تین ناول " دائرہ "، "ناتمام "اور " بھید "چھپ چکے ہیں۔ مجوزہ تحقیق میں ان کے دوناولوں " دائرہ" اور " بھید " میں پیش کیے جانے والے لاہور کے مقامات اور کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

۲۔ بیانِ مسئلہ:

محمد عاصم بٹ نے نئے لکھنے والوں میں اپنی منفرد پہچان بنائی۔ محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں جھلکتے ہوئے لاہور کے تمام مقامات اور ان ناولوں میں پیش کیے جانے والے کردار منفرد اور اپنی لسانی و ثقافتی پہچان میں اچھوتے ہیں۔عاصم بٹ کو لاہور اسی طرح محبوب ہے جس طرح قدیمی متون میں دہلی اور لکھنؤ کا تذکرہ ملتا ہے۔اسی تناظر

میں ضروری تھا کہ عاصم بٹ کے ناولوں میں لاہور کی زندہ جاوید حیثیت کا تجزیہ کیا جائے اور اس کے مخصوص اوراہم عناصر کو زیرِ بحث لایا جائے۔

۳۔ مقاصدِ تحقیق:

محمد عاصم بٹ کے ناولوں "دائرہ" اور "بھید" میں چونکہ شہر لاہور کو بطور پس منظر پیش گیا ہے اور شہر لاہور ان ناولوں کے مرکزی کرداروں میں سے ایک ہے اس لیے عاصم بٹ کے دونوں ناول اپنے اندر شہر لاہور کے کئی راز سموئے ہوئے ہیں۔ ان رازوں کو جاننے سے شہر لاہور کی تاریخی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی صورتحال کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے اور اس طرح اس بات کی تحقیق بھی ممکن ہو پائے گی کہ شہر لاہور کی اس مجموعی صورتحال نے اردو ادب پر کیا اثرات مرتب کیے اور اس کا پس منظر کیا ہے۔ اس بات کو درج ذیل نکات کی روشنی میں سمجھنے کی سعی کی گئی ہے۔

۱۔ محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں بیان کردہ لاہور شہر کے مقامات کا جائزہ لینا۔

۲۔ محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں لاہور شہر کے پیش کردہ کرداروں کا تجزیہ کرنا۔

۴۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں لاہوری ثقافت کی پیش کش کی نوعیت کیا ہے؟

۲۔ محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں لاہور شہر سے متعلق مقامات کی شناختیں کیا ہیں؟

۳۔ محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں لاہور شہر کے کردار کون سے ہیں اور ان کو کیسے پیش کیا گیا ہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار:

کسی بھی مصنف کی تخلیق کے پس پردہ تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی عناصر کارفرماں ہوتے ہیں جو اس کی ذہنی اور جذباتی وابستگیوں کے عکاس ہوتے ہیں جو اس صنف ادب میں خود بخود در آتے ہیں اور کچھ کو وہ خود اختیار کرتا ہے اور وہ عناصر اس کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر کسی تخلیق کار کی تخلیق کو کسی دوسرے تخلیق کار

سے الگ حیثیت دی جاتی ہے۔زیرِ نظر تحقیق میں اسی ادبی تناظر میں مختلف ادباء جیسا کہ اے حمید کی کتاب "دیکھو شہر لاہور،لاہور کی باتیں"، "عطاالحق قاسمی" غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور" کے تناظر میں محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں پائے جانے لاہور کے مقامات اور کرداروں تجزیہ کیا گیا ہے اور لاہوری ثقافت کو دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار:

زیرِ نظر مقالے میں محمد عاصم بٹ کے ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے ۔دستاویزی اور بنیادی ماخذات کے ساتھ ساتھ ثانوی ماخذات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں لاہور شہر کے مقامات اور کرداروں کو مختلف ادباء کے پیش کردہ کرداروں اور مقامات کے پیش نظر اس تحقیق میں تجزیاتی طریقہ کار کو مثبت نتائج کا حامل سمجھتے ہوے تجزیاتی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔بنیادی ماخذات میں محمد عاصم بٹ کی کتابیں جبکہ ثانوی ماخذات کے طور پر محمد عاصم بٹ کے ناولوں اور اردو ناول پر چھپنے والے مختلف مضامین، کتب اور رسائل کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ثانوی ماخذات تک رسائی کے لیے مختلف لائبریریوں سے رجوع کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ اور دیگر ماخذات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

محمد عاصم بٹ موجودہ دور کے نمایاں لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی ادبی خدمات پر متعدد ناقدین اپنی آراء کا اظہار کر چکے ہیں۔ان کے کی ادبی خدمات پر ایم فل کی سطح کا ایک مقالہ بعنوان "محمد عاصم بٹ کی ادبی خدمات" از نادیہ اشرف تحریر کیا جا چکا ہے۔اس کے علاوہ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ایم اے کی سطح کا ایک مقالہ اور کئی مضامین بھی چھپ چکے ہیں۔ ان کے ناولوں میں پائی جانے والی لاہور شہر کی شناختوں اور لاہور میں بسنے والے کرداروں کی پیش کش پر ابھی کوئی کام نہیں ہوا تھا۔یہ تحقیق اسی سلسلے کی ایک سعی ہے۔

۸۔ تحدید:

زیرِ نظر تحقیق میں محمد عاصم بٹ کے ناولوں "دائرہ" اور "بھید" شامل ہیں۔ میں نے ان ناولوں میں پیش کیے جانے والے لاہور کے مقامات اور کرداروں کے حوالے سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔

9۔ پس منظری مطالعہ:

پس منظری مطالعہ کے طور محمد عاصم بٹ کے ناولوں پر لکھے گئے مضامین کے ساتھ ساتھ مختلف تنقیدی کتب کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ناقدین کی آراء، تبصروں انٹرویوزاور تجزیوں کو بھی شاملِ تحقیق کیا گیا ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت:

اردو ادب کا دامن بہت وسیع ہے۔ اردو ادب میں بہت سے ناول نگاروں نے مختلف موضوعات پر ناول لکھے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کا شمار کامیاب ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ جدید دور کے ناول نگاروں میں محمد عاصم بٹ کا نام بھی شامل ہے۔ محمد عاصم بٹ نے اپنے ناولوں میں شہر لاہور کی زندگی کو ہمارے سامنے پینٹ کیا ہے۔ وہ اپنے فن میں کمال رکھتے ہیں اور کہانی کی بنت کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہیں۔ محمد عاصم بٹ کے ناولوں کے پس منظر میں کرداروں کے سوا ایک اور بھید شہر لاہور کا ہے جو اس کے ناولوں کے مرکزی کرداروں میں سے ایک ہے۔ عاصم بٹ نے اپنے ناولوں میں لاہور سے وفا کی ہے۔ اس کی روح میں اتر کر اسے ایک زندہ شہر کر دیا ہے۔ اس تحقیق کے ذریعے ان ناولوں میں پیش کیے جانے والے مقامات اور کرداروں کا شہر لاہور کے حوالے سے تجزیہ کیا گیا ہے۔

ابتدائی زندگی:

پاکستان کے شہر لاہور سے تعلق رکھنے والے محمد عاصم بٹ کا شمار دورِ جدید میں بطور ناول نگار، مدیر اور مترجم کے ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنی فکر و نظر کی گہرائی اور تخیل کی بلند پروازی سے دورِ جدید کے انسانی مسائل اور رویوں کی عکاسی کی ہے۔

محمد عاصم بٹ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۶ء کو بحرین میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام یونس بٹ اور والدہ کا نام تسنیم بیگم ہے۔ آپ کل چھ بہن بھائی ہیں اور آپ سب بہن بھائیوں سے بڑے ہیں۔ والدہ تسنیم بیگم نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے حصول کے لیے بحرین سے لاہور میں سکونت اختیار کی اور آپ بھی والدہ کے ساتھ ننہال میں رہے۔ شروع میں یہ خاندان گوالمنڈی کے علاقے میں قیام پذیر ہوا اور پھر لاہوری دروازہ منتقل ہو گیا۔ وہاں پر پہلے سوتر منڈی اور اس کے بعد محلہ موہلیاں میں رہائش اختیار کی۔

ابتدائی تعلیم:

لاہور میں آکر جماعت دوم میں داخلہ لیا اور پھر سید مٹھا بازار میں گورنمنٹ آصفہ ماڈل سکول میں پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ مسلم ماڈل ہائی سکول سے سائنس مضامین میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہاشمی میموریل کالج آف کامرس سے بی کام کیا۔ ہیلے کالج آف کامرس پنجاب یونیورسٹی سے ایم کام کیا۔ ان کے والد صاحب کی خواہش تھی کہ وہ میڈیکل شعبہ کا انتخاب کریں لیکن انہوں نے بالکل اس کے برعکس شعبہ اختیار کیا۔

علمی زندگی کا آغاز:

۱۹۸۹ء میں بی کام کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج یونیورسٹی سے فلسفہ میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی اور ساتھ ساتھ کام کی تلاش کا ایک سلسلہ بھی جاری رکھا اور اپنی عملی زمدگی کا آغاز ایک کاپی رائٹر کے طور پر کیا اور پھر اسی میدان میں کامیابیاں سمیٹیں۔ اس حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ

"ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں بطور کاپی رائٹر کے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی دوران میں جنگ پبلشرز کے ساتھ کام کرنے کا معاہدہ طے پایا۔ اس کام سے انہیں کوئی خاص مالی فائدہ کی امید نہیں تھی لیکن کیونکہ یہ کام ان کے مزاج کے مطابق تھا اس لیے انہوں نے اپنی پہلی نوکری سے استعفی دے دیا"(۱)

اس کے بعد اپنا تمام وقت پنجاب پبلک لائبریری میں اردو ترجمہ کرنے میں گزرتے۔ ایک سال میں ان کا کام مکمل ہوا تو جنگ پبلیشرز میں ہی بطور پروڈکشن ایڈیٹر کام کیا۔ اسی سال پی پی ایس سی کی طرف سے لیکچرر کی اسامیاں جاری ہوئیں تو درخواست جمع کرائی اور انٹرویو پاس کیا اور منتخب ہوئے اور کچھ عرصہ بطور لیکچرار وہ اس کالج میں اپنی خدمات سر انجام دیتے رہے لیکن زیادہ عرصہ نہ چل سکے اور اس نوکری سے استعفی دے دیا۔ اس استعفی کی وجہ انہوں نے یوں بتائی:

ان کی رہائش لاہور میں تھی اور چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داری بھی تھی اور یہ نوکری لاہور سے کافی دور ہونے کی وجہ سے انہوں نے اس نوکری کو خیر باد کہہ دیا"(۲)

کچھ عرصے بعد ہی جنگ پبلشرز سے بھی مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے بے شمار کتابوں کے تراجم کئے۔ اس کے علاوہ "دی نیوز فرنٹیئر پوسٹ"، "فرائیڈے ٹائمز" اور "ہفت آج کل" کے لیے فیچر اور مضامین لکھے۔ اس کے بعد صحافت کی بجائے کمپیوٹر سائنس کے شعبے میں مزید تعلیم حاصل کرنے اور کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ کمپیوٹر ڈپلومہ کی پوسٹ گریجویٹ ڈگری کے لئے داخلہ بھی لے لیا لیکن اسی دوران میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد میں نوکری ہو گئی۔ جس کی وجہ سے لاہور سے اسلام آباد منتقل ہو گئے۔

چار ماہ کے عرصے میں بیزار ہو کر راولپنڈی منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے اپنے ناول اور کہانیاں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ افسانوی مجموعہ "دستک" بھی اسی دوران میں لکھا گیا۔ ۱۹۹۸ء میں اس نوکری سے بھی استعفی دے دیا اور ایک غیر سرکاری ادارے "دی نیٹ ورک" میں نوکری کی۔ اس ادارے کے تحت شائع ہونے والے رسالے کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ وہاں تین سال تک کام کیا تو لاہور کی یاد ستانے لگی۔ واپس لاہور جانے کا فیصلہ کیا اور نوکری سے استعفی دے دیا۔ لیکن "دی نیٹ ورک" کی انتظامیہ نے انہیں لاہور میں رہتے ہوئے ہی

کام کرنے کی اجازت دے دی اور ڈیڑھ سال مزید نوکری کی۔ پھر اس سے استعفی دے دیا اور لاہور کی ایک این جی او "عورت فاؤنڈیشن" میں نوکری کر لی۔ دو سال بعد دوبارہ "دی نیٹ ورک" نے پھر سے بلایا تو اسلام آباد نقل مکانی کر گئے۔

ادبی سرگرمیاں:

محمد عاصم بٹ نے بے شمار موضوعات پر کتابیں پڑھیں۔ جن میں مذہب، تاریخ، فلسفہ، سماجیات اور ادب شامل تھے۔ وہ ان کتابوں کو انارکلی بازار میں لگنے والے اتوار بازار سے خرید لاتے تھے۔ انہوں نے ڈائجسٹوں اور رومانوی دنیا کا ادب بھی پڑھا۔ لکھنے کا آغاز شاعری سے کیا۔ آپ ناصر کاظمی سے بے حد متاثر ہوئے اور انہیں کی طرح چھوٹی بحر میں غزل لکھی۔ ان کی ابتدائی شاعری ماہنامہ "ماہ نو" میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ مزید کچھ اور رسائل میں بھی شائع ہوئی۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے شاعری ترک کر دی اور کہانیوں کی طرف آ گئے۔ شاعری ترک کرنے کی وجہ بڑی دلچسپ ہے۔ شاعری کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ محبت کے جذبے کے بغیر شاعری میں تاثیر نہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> "شاعری کے لیے کسی نہ کسی جذبے کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کا یہ جذبہ ان کی محبوبہ کی وجہ سے تھا جس سے وہ محبت کرتے تھے اور جب اس کی شادی کسی اور سے ہو گئی تو انہوں نے شاعری چھوڑ دی"[۳]

انہوں نے بھی ایک عام آدمی کی طرح ایک لڑکی سے محبت کی تھی لیکن اظہار نہ کر سکے اور اس لڑکی کی شادی کسی اور سے ہو گئی جس وجہ سے انہوں نے شاعری چھوڑ کر افسانے کی طرف رخ کیا اور ایم اے کے دوران انہوں نے اپنا پہلا افسانہ "پسِ آئینہ" لکھا جو کہ ستمبر ۱۹۹۸ء میں "ماہ نو" میں شائع ہوا۔ اس وقت "ماہ نو" کی چیف ایڈیٹر کشور ناہید تھیں اور انہوں نے افسانے کے لئے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا اور یہ بھی کہا کہ وہ کافکا اور کامیوں کے اثر سے باہر نکلنے کی کوشش کریں جبکہ اس وقت تک کافکا سے نا آشنا تھے۔ اس حوالے سے عاصم بٹ کا کہنا تھا:

"میں کامیوں کو تو پہلے پڑھ چکا تھا جبکہ کافکا سے میری دلچسپی کشور ناہید کے کہنے سے ہوئی۔اس کے بعد میں نے کافکا کا ناول "دی ٹرائل" پڑھااور ساتھ ساتھ ترجمہ بھی کیا۔ دیگر کتب تک رسائی حاصل ہوئی توان میں سے پسندیدہ کہانیوں کو ترجمہ کرتارہااور یوں کچھ کہانیاں ترجمہ ہوئیں"(۴)

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ یہ تمام کام انہوں نے تب سرانجام دیئے جب "جنگ پبلشرز" میں نوکری کرتے تھے۔انہیں دنوں میں یہ ترجمہ "کافکا کہانیاں" کے نام سے جنگ پبلیشرز کے زیر اہتمام ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۳ءاور تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا جو کہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس کے علاوہ عاصم بٹ کا کہنا ہے کہ جب انہوں نے ناول لکھنے کے بارے میں سوچا تو انہیں ایڈورٹائزنگ کی نوکری کے دوران میں ایک کہانی سوجھی۔

جس کا تھیم کچھ یوں تھا کہ جو کچھ ہم زندگی میں کرتے ہیں وہ ایک سکرپٹ کی صورت میں پہلے سے لکھا ہوا ہے اور ہم سب اداکاری کر رہے ہیں۔جو کیا ہو گا کہ ہمارے آس پاس کا منظر مصنوعی طور پر بنایا گیا ہے۔پہلے انہوں نے اس پر طویل کہانی لکھی۔ اس کے بعد ناول کی صورت میں اس کہانی کو تشکیل دیا اور ساتھ ساتھ مزید دوسری کہانیاں بھی لکھتے رہے۔اس ناول کے کچھ مسودے بک گئے اور وہ اس کے آخری مسودے میں ترامیم کرتے رہے۔ناول مکمل ہونے کے بعد ایک سے زائد پبلیشرز کے پاس کافی عرصہ پڑا رہااور آخر کار ۲۰۰۱ء میں کراچی پبلشرز کے تحت یہ ناول چھپا۔

جب "سویرا" میں پہلی کہانی "تیز بارش میں ہونے والے واقعات" شائع ہوئی تو محمد سلیم الرحمن نے نیر مسعود کی کتاب "سیماب" بطور انعام دی۔ یہ کہانی انہوں نے حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں پڑھی جس اجلاس کی صدارت مظفر علی سید نے کی تھی۔اس کے علاوہ انہیں اپنے ناول پر یو بی ایل لٹریری ایکسیلینس ایوارڈ ملا۔ لیکن محمد سلیم الرحمن کی عطا کردہ کتاب کو اپنا سب سے بڑا انعام مانتے ہیں۔

بہت سی کہانیاں بھارت سے شائع ہونے والے رسالے "شب خون" میں شائع ہوئیں جس کی ادارت شمس الرحمان فاروقی کرتے تھے۔۱۹۹۸ء میں کہانیوں کا پہلا مجموعہ "اشتہاری آدمی" شائع ہوا۔دوسرا

مجموعہ "دستک" ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا اور اسی طرح ان کا پہلا ناول "دائرہ" ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا دوسرا اور تیسرا ایڈیشن سنگ میل لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ دوسرا ناول "نا تمام" بھی ۲۰۱۴ء میں سنگ میل لاہور سے شائع ہوا۔

سیموئل بیکٹ کے شہرہ آفاق ڈرامے "گوڈ کے انتظار میں" کا ترجمہ "سو عظیم آدمی" کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ کافکا اور بورخس کی دیگر کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ مائکل ہارٹ کی کتاب کا ترجمہ "سو عظیم آدمی" کے عنوان کے ساتھ کیا جو کہ اس وقت کی سب سے زیادہ بکنے والی کتب میں شامل رہی۔ اب تک عاصم بٹ کی دو درجن کے لگ بھگ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں تین ناول، دو کہانیوں کے مجموعے اور تنقید و تحقیق پر مشتمل کتابیں ہیں۔ کہانیوں کا تیسرا مجموعہ زیر طبع ہے جبکہ چوتھا ناول زیرِ تکمیل ہے۔ عاصم بٹ کے ادبی مقام کے حوالے سے حمید شاہد لکھتے ہیں:

> "عاصم بٹ تخلیقی سطح پر تفکر سے دوچار ہوتے ہوئے بھی فکر اور نقطہ نظر کے نامیاتی وحدت میں ڈھل جانے سے شعوری سطح پر گریزاں رہا ہے۔ ایک فکری نظام کی تشکیل یا پہلے سے تشکیل شدہ نظام سے وابستگی کی بجائے اس کی کہانی کا مکمل انحصار جزو نگاری، فضابلندی اور کرداروں کی تشکیل پر ہوتا ہے۔ اور عاصم کے ہاں کہانی کے یہ وسیلے خوبی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں"(۵)

محمد عاصم بٹ نے شروع میں انگریز مصنفین کو زیادہ پڑھا ساتھ ساتھ ان کی تحریروں کے تراجم بھی کیے جن میں بعض تراجم کو بے حد پسند کیا گیا اور ان تراجم نے ہی ان میں ایک لکھاری کی روح پھونکی اور وہ ایک پختہ اور نامور تخلیق کار کے طور پر سامنے آئے۔ انہوں نے انگریز ادیبوں کافکا کو بڑا لکھاری مانا لیکن مارکیز کو انہوں نے فکشن کا امام قرار دیا۔ اسی طرح اردو ادب میں انہوں نے بہت سے نامور افسانہ نگاروں کو پڑھا اور ان کی تحریروں پر کچھ تبصرے بھی کیے اور ان میں چند ایک ناموں کو اپنے پسندیدہ افسانہ نگاروں کی لسٹ میں بھی جگہ دی ۔انگریزی اور اردو ادب کے مصنفین کے حوالے سے ان کا کہنا تھا:

"وہ کافکا اور بورخس سے متاثر ہیں لیکن مارکیز کو فکشن کا امام مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ فلابیئر، میلان کنڈیرا بھی ان کے پسندیدہ ادیب ہیں۔ منٹو سے بے حد متاثر ہوئے لیکن غلام عباس اور بیدی کو اردو افسانے کا امام مانتے ہیں"(۶)

اردو ناول میں قرۃ العین حیدر، عبد اللہ حسین اور مستنصر حسین تارڑ ان کو بے حد پسند ہیں۔ اور نئے لکھنے والوں میں مرزا الحر بیگ جو کہ فلسفہ میں ان کے استاد ہیں ان کو ایک متاثر کن ناول نگار کے طور پر مانتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہر دور کے اندر کچھ اصناف کے ترقی کے راز پوشیدہ ہوتے ہیں اس حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ

"موجودہ عہد کی بس دو ہی ادبی اصناف ہیں۔ ناول اور نظم جو باقی رہنے کا واضح امکان رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصری پیچیدہ حقیقت نگاری کو سابقہ سادی حقیقت نگاری کے پیرائے میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ موجودہ صورتحال کے بیان کے لیے ایک پیچیدہ پیرائے اظہار درکار ہے جو کہ ناول اور نظم جیسی اصناف میں ہی ممکن ہے"(۷)

اس لیے محمد عاصم بٹ کے مطابق جدید انسان کا بیان اگرچہ ممکن ہے تو صرف اور صرف ناول ہی کی صنف میں جس کی ہیئت کے امکانات کی حد بندی کرنا ممکن نہیں اور ہر نیا جینئس اس کی ہیئت کو از سر نو تعمیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کے پیچھے بہت سارے عوامل کار فرما ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ لکھاری کی سوچ اور اس کا فن پر عبور ہی اس تخلیق کا اعلی درجے کی تخلیقات کی صف میں شامل کرتا ہے۔ عاصم بٹ کا کہنا ہے کہ

" لفظ میں روح کو پھونکنے کے لیے لکھنے والے کو فنا فی الادب کے درجے پر پہنچنا بے حد ضروری ہے۔ جبکہ نئے لکھنے والے میڈیا کے زیر اثر جلد مشہور ہونے کی خبط میں اپنے جوہر کے پختہ ہونے کے معاملے میں عجلت کا شکار ہوتے ہیں"(۸)

کسی بھی لکھاری یا تخلیق کار کے لیے فنا فی الادب کے درجوں کو چھونے کے ساتھ ساتھ اپنے جوہر کی پختگی کا حاصل ہونا از حد ضروری ہے۔

دیگر مشاغل:

محمد عاصم بٹ کی عمر کا بیشتر حصہ ایک طاقتور اتھلیٹ کے طور پر گزرا۔ ان کے پاس کراٹے میں اورنج بیلٹ ہے جبکہ انہوں نے جمناسٹک کی بھی تربیت حاصل کی تھی۔ ایک زمانے میں بیڈمنٹن کے بہت شوقین رہے۔ جاگنگ سے ہمیشہ والہانہ لگاؤ رہا۔ موسیقی اور یوگا خصوصی دلچسپی کے مراکز رہے ہیں۔ خاص طور پر چند سال موسیقی کی تربیت بھی حاصل کی۔ اتھلیٹ ہونے کی وجہ سے آواز گلوکاری کے لئے موزوں نہ پائی تو ہارمونیم اور طبلہ بجانے کی تربیت لی۔ آوارگی کے ہس مزاج میں نمایاں ہے۔ انکے مزاج کے بارے میں لیکن پڑھنے کی چاٹ بہت چھوٹی عمر میں ایسی لگی کہ آہستہ آہستہ سب مشاغل پر حاوی ہوتی گئی۔ یہی مطالعہ کی عادت لکھنے کی طرف لائی۔ ایم اے کے بعد لکھنے اور پڑھنے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

۲۰۱۶ء میں اکادمی ادبیات پاکستان میں خالی آسامیوں پر اشتہار چھپا تو وہاں درخواست جمع کرائی اور ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے کے لیے منتخب ہو گئے۔ وہاں سہ ماہی "ادبیات" کی ادارت کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ آج کل آپ ادبیات پاکستان کے لاہور مرکز میں ریزیڈنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر تعینات ہیں۔ عاصم بٹ کی خدمات کے حوالے سے زاہد مسعود لکھتے ہیں کہ

> "محمد عاصم بٹ ایک مستقل شخصیت ہے اس نے ادبیات کے کئی خصوصی نمبر ترتیب دیے جو اردو ادب کی تاریخ کا معتبر حوالہ ہیں"(۹)

اعزازات:

محمد عاصم بٹ کے ناول "ناتمام" کو یو بی ایل لٹریری ایکسیلینس ایوارڈ برائے سال ۲۰۱۵ء دیا گیا۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، پنجاب یونیورسٹی لاہور، اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد، سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ ہائے اردو نے محمد عاصم بٹ کی فکشن نگاری اور ترجمہ نگاری پر ایم اے، بی ایس، اور ایم فل کی سطح کے مقالات لکھوائے ہیں۔ ادبی حلقوں میں مختلف مصنفین نے آپ کی فکشن نگاری اور ناولوں پر کئی مضامین لکھے

ہیں۔ جن میں ایم خالد فیاض، رفاقت جی، رفعت ناہید، انور سدید، مستنصر حسین تارڑ، شفیق انجم اور اس کے علاوہ کئی ادبی شخصیات آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کی تعریف کر چکے ہیں۔

تین ناول نگار کے عنوان سے روبینہ سلطان کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں محمد عاصم بٹ کی ناول نگاری پر ایک مفصل باب شامل ہے۔

اوکسفر لٹریچر فیسٹیول سمیت اندرون ملک اور بیرون ملک متعدد ادبی تقریبات اور کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ اور انگریزی کے ایک سے زائد افسانوی انتخابات میں آپ کی تحریریں شامل ہیں۔

فنکشن:

اشتہاری آدمی (کہانیوں کا مجموعہ) ۱۹۹۸ء فکشن ہاؤس، لاہور

دائرہ (ناول) ۲۰۰۱ء سنگِ میل پبلکیشنز، لاہور

دستک "کہانیوں کا مجموعہ) ۲۰۰۹ء شہزاد، کراچی

ناتمام (ناول) ۲۰۰۹ء سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور

بھید (ناول) ۲۰۱۸ء سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور

تراجم انگریزی سے اردو میں:۔

کافکا کہانیاں (فائز کافکا کی کہانیوں کے تراجم) ۱۹۹۳ء نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

سو عظیم آدمی (مائیکل ہارٹ کی کتاب "دی ہندوڈ" کا ترجمہ) ۱۹۹۳ء تخلیقات، لاہور

فیڈیلیو (معروف موسیقار بیتھوون کے ناٹک کا ترجمہ)

نوبل انعام تک سفر (ایرک کارل کے منتخب کلام کا ترجمہ اور سوانحی خاکہ) ۲۰۱۵ء نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

توہمات کی دنیا (کارل سیگان کی کتاب کا ترجمہ) ۲۰۰۲ء مشعل بکس، لاہور

تراجم انگریزی سے اردو:

Story of four saints(قصہ چار درویش کا انگریزی روپ)۲۰۱۶ء نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

تحقیق و تنقید:

دوسرا آدمی (اہل قلم سے انٹرویوز)۱۹۹۹ء جنگ پبلشرز، لاہور

عبداللہ حسین: شخصیت اور فن ۲۰۱۶ء اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

پاکستان سال بہ سال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

دانشِ مشرق (مشرق کے مفکرین پر سوانحی اور تنقیدی مقالات)۲۰۱۶ء دستاویزات مطبوعات، لاہور۔

حوالہ جات

۱۔ مقالہ نگار کا محمد عاصم بٹ سے انٹرویو، بمقام اکادمی ادبیات، لاہور، ۱۸ اگست ۲۰۲۰ء

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ محمد حمید شاہد، عاصم بٹ کے فکشن کی تخلیقی فضا، ادبی تنازعات حرف اکادمی، س ن، ص ۳

۶۔ مقالہ نگار کا محمد عاصم بٹ سے انٹرویو، بمقام اکادمی ادبیات، لاہور، ۲۰ اگست ۲۰۲۰ء

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً

۹۔ زاہد مسعود، شخصی خاکہ "محمد عاصم بٹ" حلقہ اربابِ ذوق، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۸

باب دوم:

ثقافت اور لاہور شہر کی مخصوص ثقافت:۔

لاہور شہر:۔

"بھید" اور "دائرہ" دونوں ناول اپنے پس منظر میں لاہور کی فضا اور ماحول رکھتے ہیں۔ جہاں چلتے پھرتے کردار مکالماتی سطح پر متعامل نظر آتے ہیں۔ زمان و مکان کہانی کی بنیادی اکائیوں کے طور پر مسلمات تصور کیے جاتے ہیں۔ ان ناولوں کے پس منظر میں لاہور کا مطالعہ کرنے سے قبل لاہور شہر کی تاریخی اہمیت اور ثقافت کا جاننا اہمیت اور افادیت سے خالی نہ ہو گا۔

لاہور شہر کی طویل تاریخ ماضی کے سحر میں گم ہے اور اس کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں صرف قیاس آرائی پر مبنی کچھ روایات ملتی ہیں۔ مگر عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ راجہ رام موہن کے دو بیٹے تھے۔ جن میں ایک کا نام قصوہ تھا جس نے قصور شہر کو آباد کیا اور دوسرے بیٹے کا نام لاہو تھا جس نے لاہور شہر بسایا۔ لاہور شہر کب سے آباد ہے اس کی کوئی واضح تاریخ سامنے نہیں آسکی۔ اس حوالے سے سوم آنند اپنی کتاب "لاہور کی باتیں" میں لکھتے ہیں:

> "لاہور ایک تاریخی شہر ہے۔ یہ کب آباد ہوا، اس کے متعلق بہت سی کہانیاں ہیں۔ زیادہ اہمیت اسے مغلوں کے دورِ حکومت میں حاصل ہوئی۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں تو یہ کئی برسوں تک دارالحکومت کا کام بھی دیتا رہا"(۱)

ابتدا میں اس کا نام لہور رکھا گیا اور بعد میں آہستہ آہستہ لاہور بن گیا۔ اس کے قدیم ترین شہر ہونے کے حوالے سے بہت ساری روایات ملتی ہیں۔ ۹۹۴ء میں لاہور ملتان کے ماتحت علاقوں میں شامل تھا اور ملتان کا حاکم قریشی کہلاتا تھا۔ الغرض لاہور شہر کی موجودگی کا واضح ثبوت سبکتگین اور اس کے بیٹے محمود غزنوی کے حملوں کے

دوران میں ملتا ہے جب اس نے یہ علاقہ فتح کیا۔ اس کی نشاندہی محکمہ آثار قدیمہ نے ۱۹۵۹ء میں ضلع لاہور میں جدید خطوط پر کھدائی کرنے کے بعد کی۔

کھدائی کے نتیجے میں ملنے والے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل اس قلعہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ عہد غزنوی ۹۷۶ء سے لے کر ابراہیم لودھی ۱۵۷۵ء تک آنے والی حکومتوں نے لاہور شہر کو ایک خاص مقام عطا کیا۔ اس سلسلے میں سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۲۱ء کو لاہور فتح کرنے کے بعد ایک نیا قلعہ تعمیر کرایا۔ برصغیر میں مسلم سلطان قطب الدین ایبک کی تاج پوشی اسی قلعہ لاہور میں ہوئی۔ اس طرح جب تغلق سلطنت زوال پزیر ہوئی تو شیخ مبارک شاہ نے شیخا کھوکھر کے بیٹے عشرت کھوکھر کو شکست دے کر لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ اولین مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کے ہاتھوں لاہور شہر کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا مگر بعد کے بادشاہوں نے لاہور شہر کی کافی پذیرائی کی اور اسے ترقی کی منازل کی طرف گامزن رکھا۔

شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دے کر ہیبت خان نیازی کو لاہور کا راجہ مقرر کیا۔ جس نے لاہور میں اپنی رہائش رکھی لیکن زیادہ دیر نہ رہ سکا اور دوبارہ ہمایوں تخت نشین ہو گیا۔ ہمایوں کی اچانک موت پر اس کے بیٹے جلال الدین اکبر کی تاج پوشی لاہور میں ہوئی تو اس وقت اکبر کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ وہ ۱۵۷۶، ۱۵۵۷، اور ۱۵۸۶ء کو لاہور آئے اور باقاعدہ طور پر پر تعمیرات کرنے کی ہدایات جاری کیں اور لاہور کو دارالسلطنت بنایا۔ ہمایوں کی وفات کے بعد اس کے بیٹے نورالدین جہانگیر نے حکومت سنبھالی اور ۱۶۰۶ء میں لاہور کا دورہ کیا۔ اس ایک سالہ قیام میں بہت ساری عمارتیں تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ جہانگیر کے بعد اس کے بیٹے شاہ جہاں نے حکومت کے پہلے ہی سال میں شاہی قلعہ لاہور میں عمارتیں تعمیر کرائیں اور ان پر سنگ مرمر سے کام کرایا۔ ۱۶۳۶ء میں شاہجہان نے کچھ عرصہ کے لئے قلعہ لاہور میں قیام کیا۔

شاہ جہان کے بعد اس کا بیٹا اورنگزیب عالمگیر اس حکومت کا مالک بنا اور ۱۶۵۸ء کے بعد یہاں مستقل سکونت اختیار کی۔ لاہور کی بادشاہی مسجد اور عالمگیری دروازہ اسی کے حکم پر تعمیر ہوئے۔ اس کے بعد عالمگیر کے جانشینوں میں اختلافات پیدا ہو گئے اور اور لڑائیاں شروع ہوئیں۔ جس کے نتیجے میں مغل دارالحکومت زوال پذیر ہو گیا اور حکومت کئی حصوں میں بٹ گئی اور لاہور پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ لاہور پر قابض

ہوا اور ایک بہت بڑا جشن منایا جو جشنِ لاہور کے نام سے تاریخ کے اوراق میں یاد کیا جاتا ہے۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا کھڑک سنگھ ایک سال حکومت کرنے کے بعد موت کی وادی میں چلا گیا۔

اس کی وفات کے بعد اس کے جانشین بھی سیاسی انتشار میں بٹ گئے جس کی وجہ سے لاہور شہر کی عمارتوں کو شدید نقصان ہوا۔ سب سے آخر میں اگرچہ دلیپ سنگھ نے حکومت کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف رنجیت سنگھ کی بیوی رانی چندراں اور کچھ سکھوں نے مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا جس کے نتیجے میں انگریز لاہور پر قابض ہو گیا۔ انگریز نے ۱۸۴۹ء کو دلیپ سنگھ کو معزول کر کے سکھ حکومت کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا۔ ۱۸۴۹ء سے لے کر ۱۹۲۷ء تک شاہی قلعہ انگریز کا مسکن رہا اور اس نے اپنی مرضی سے اس میں کئی تبدیلیاں کرا دیں۔ بالآخر ۱۹۲۷ء میں محکمہ آثار قدیمہ نے ان تاریخی عمارتوں کو اپنی تحویل میں لے کر ان کی مرمت کا کام شروع کر دیا۔

لاہور پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے جو کہ پنجاب کا دارالحکومت ہے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے جو کہ ایک ہزار برس سے علاقے کا تہذیبی، ثقافتی، سفارتی، سیاسی اور معاشی مرکز ہے۔ لاہور شہر کو تاریخی عمارات، مساجد، مقبروں اور باغات کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل ہے۔ ان میں جہانگیر کا مقبرہ، شالامار باغ، مسجد وزیر خان، بادشاہی مسجد، مقبرہ آصف جہاں نمایاں ہیں۔

اس شہر میں کئی بزرگ صوفیاء کرام کے مزارات بھی واقع ہیں جن میں حضرت داتا گنج بخش، مادھولال حسین، حضرت میاں میر، حضرت شاہ ابو المعالی، علی حضرت موج دریا بخاری، حضرت شاہ جمال، حضرت شاہ غوث اور حضرت میاں وارث شاہ اور میاں وڈھا شامل ہیں۔

لاہور شہر دریائے راوی کے مشرقی کنارے پر آباد ہے۔ لاہور کا موجودہ شہر کئی جدید بستیوں اور عمارات سے آراستہ ہو چکا ہے۔ ان میں ماڈل ٹاؤن، ڈیفنس، گلبرگ، سبزہ زار سکیم، گرین ٹاؤن، ٹاؤن شپ اور بحریہ ٹاؤن نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال انٹرنیشنل ائیرپورٹ، پنجاب یونیورسٹی، مینار پاکستان، عجائب گھر، مال روڈ، شالامار باغ، اردو بازار، انارکلی بازار، گلشن اقبال اور ریس کورس پارک شامل ہیں۔ لاہور کی موجودہ آبادی پچھتر لاکھ سے زیادہ ہے۔ لاہور صدیوں پرانا شہر ہے اور ایک اہم ترین ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور تجارتی مرکز ہے۔ ہمیشہ پنجاب کا

دارالحکومت رہا۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے یکم جولائی ۱۹۷۰ء تک یہ شہر صوبہ مغربی پاکستان کا دارالحکومت بھی رہا۔ جبکہ ماضی میں یہ سکھوں کی سلطنت کا مرکز بھی تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں لاہور کو ہلال استقلال ملا تھا۔ پاکستان کے اسی شہر میں شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ابدی نیند سو رہے ہیں۔ عاصم بٹ نے تاریخی جھروکوں کو اپنے قلم کی نوک سے تحریری سطح پر ناولوں کی زینت بنایا ہے۔ بڑے ادیب کا کمال ہوتا ہے کہ وہ جب اپنے فن پارے یا شہ پارے میں تاریخ کو یوں سمو دیتا ہے کہ تاریخ اور تحریر باہم مدغم ہو کر حسین اور منطقی نتائج بر آمد کرتا ہے۔

کلچر کی تعریف:

لفظ "کلچر" کا ترجمہ اردو زبان میں ثقافت کیا جا سکتا ہے، لیکن جن معنوں میں ہم لفظ ثقافت روزمرہ میں استعمال کرتے ہیں اس کے اصل معنی اس سے بہت وسیع ہیں۔ دراصل کلچر کا مطلب ہے کہ کسی چھوٹے یا بڑے علاقے میں جو لوگ رہتے ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ ان میں کچھ عادتیں، رہن سہن، طور طریقے اور معاشرتی رویے پیدا ہو جاتے ہیں جن کے نتیجے میں معاشرہ تشکیل پاتا ہے جس کے کچھ اصول ہوتے ہیں، کچھ قوانین بنتے ہیں، کچھ چیزوں کو جائز اور کچھ کو غلط سمجھا جاتا ہے۔ یہ زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتا ہے، علم سے لے کر عقائد، آرٹ، رسم و رواج، انسانوں کی عادتیں، کھانا پینا، لباس، میل جول، زبان، ادب شاعری سب اس میں شامل ہے۔ لاکھوں برس قبل جب انسانی تہذیب وجود میں آنا شروع ہوئی تو کلچر بھی خود بخود اپنی ارتقائی منازل طے کرتا گیا۔ مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی ثقافت یا کلچر بالکل مختلف ہو سکتا ہے۔

کلچر ایک مغربی اصطلاح ہے۔ یورپی یونین اس کی بے شمار تعریفیں کر چکی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ بنیادی طور پر کلچر ایک انگریزی لفظ ہے جس کا مادہ لاطینی لفظ Culture ہے۔ کلچر کی اب تک بے شمار تعریفیں ہو چکی ہیں اور اس کی جامع تعریف کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ لہذا کئی محققین کلچر کی مختلف تعریفیں کر چکے ہیں جن میں ایک جامع تعریف ڈاکٹر جمیل جالبی نے کی ہے کی وہ کلچر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کلچر (تہذیب + ثقافت) زندگی کی ساری سرگرمیوں کا خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی، ذہنی ہو یا مادی، خارجی ہو یا داخلی، جسم سے تعلق رکھتی ہو یا روح سے، احاطہ کرتا ہے۔ کلچر اس طرح

ایک وحدت، ایک اکائی کا نام ہے۔ جس میں چھلکا بھی شامل ہے اور مغز بھی، عمل بھی شامل ہے، فکر بھی۔ جسم بھی شامل ہے اور روح بھی"(۲)

یعنی جمیل جالبی کے ہاں کلچر اس چیز کا نام ہے جس میں مذہب ،عقائد، رسم و رواج، معاملات اور معاشرت ،علوم اور اخلاقیات اور وہ تمام عادتیں شامل ہیں جن سے انسان کی زندگی ہر صورت میں وابستہ نظر آتی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"کلچر کے آسان معنی ہیں۔ طرز زندگی جو کسی قانون کے بغیر رضاکارانہ معاشرے کے سب افراد میں کم و بیش مشترک حیثیت رکھتی ہے اور حسن کی شان رکھتی ہے جس میں زندگی زیادہ بامعنی اور پر راحت بن جاتی ہے"(۳)

کلچر بنیادی طور پر کسی بھی معاشرے کے رہن سہن، رسم و رواج اور اس معاشرے کے اندر لوگوں کے طرز رہائش غرضیکہ ہر چیز کا احاطہ کرتا ہے۔ اس حوالے سے فیض احمد فیض اپنی کتاب "ہماری قومی ثقافت میں لکھتے ہیں:

"کلچر یا ثقافت گانے بجانے یا لہو ولعب کا نام نہیں ہے بلکہ یہ قومی اور معاشرتی زندگی کا بہت ہی اہم شعبہ ہے۔ کلچر معاشرتی زندگی کے جملہ کاروبار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پورے طریقہ زندگی کو کلچر کہتے ہیں جس میں سب ہی کچھ شامل ہوتا ہے۔ کلچر کی اثر اندازی ذہنی طور سے بھی ہوتی ہے، عقائد اور اقدار کے ذریعے بھی۔ زندگی کے آداب ورسوم سے اور زندگی کے روزمرہ کا محاورہ ہے اس کے ذریعے بھی۔ اس میں اجتماعی زندگی کی ظاہری اور باطنی تفاصیل دونوں شامل ہوتی ہیں۔ فنون، ادب، موسیقی، مصوری اور فلم وغیرہ"(۴)

کسی بھی معاشرے کا جو بھی ڈانچہ ہو گا، جیسی اس کی ہیئت ترکیبی ہو گی یا جیسا اس کا سوشل اسٹرکچر ہو گا، کلچر بھی اس کے ہی تابع ہو گا۔ جیسے معاشرتی یا سیاسی حالات بدلتے ہیں اسی کے مطابق کلچر کے تصورات اور اشکال بھی بدلتی رہتی ہیں۔ انسائکلوپیڈیا آف دی سوشل سائنسز میں کلچر کا مفہوم ان الفاظ میں درج ہے:

"کلچر یا تمدن اپنے مفہوم کے اعتبار سے بنی نوع انسان سے متعلق معلومات کا وہ سر چشمہ ہے جس میں عقائد، آرٹ، اقدار، قوانین، رسومات کے طرز اور مزاج شامل ہوتے

ہیں۔ان عناصر سے انسان کی تشکیل ہوتی ہے اور اس تشکیل میں ڈھل کر ہی انسان اس سماج کا حصہ بن سکتا ہے"(۵)

قابل غور بات یہاں یہ ہے کہ انسائکلوپیڈیا میں تمدن، کلچر اور تہذیب کو مترادفات میں استعمال کیا گیا ہے جبکہ ان دونوں لفظوں میں ایک مہیم کی تفریق پائی جاتی ہے۔البتہ اس تعریف کے پیش نظر جو بات سمجھ آتی ہے وہ یہی ہے کہ ثقافت اصل میں کسی مخصوص ولاقے یا خطے کے لوگوں کا طرز رہائش یا طرز حیات ہے۔یہ لوگوں کا وہ سرچشمہ حیات ہے جس میں آرٹ، عقائد، رسومات واقدار اور معاشرتی ومذہبی طریقہ کار سب کچھ آتا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ ثقافت محض ایک لفظ ہی نہیں بلکہ ایک اصطلاحی مفہوم بھی رکھتی ہے اور اس کے اصطلاحی مفہوم سے واقفیت از حد ضروری ہے۔اسی غرض سے اس کی مکمل تفہیم اور تعبیر سے آگاہی کے لیے مختلف ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ ساتھ عمرانیات کے ماہرین کے اقوال و آراء کو پیش نظر رکھنا ناگزیر ہے۔ڈاکٹر عابد حسین اور وادب کے ایک معتبر اور جید نقاد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔عمرانیات پر ان کی گرفت کافی حد تک مظبوط ہے۔چونکہ عمرانیات میں لفظ ثقافت کا بھرپور چرچہ ہوتا ہے لہذا مختلف ماہرینِ عمرانیات نے ثقافت کی جامع تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر عابد حسین نے ثقافت کو سماج ومعاشرے کے اجتماعی احساس اور طرز زندگی کے معنوں میں ہی استعمال کیا ہے۔وہ ثقافت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"Culture is a sense of ultimate values possessed by a particular society as expressed in its collective institutions,by its indidual members theire dispositions, feelings ,attitudes and manners as well as in significant forms which thy give to material objects."(۶),,,,,,14

ثقافت ایک ایسی اصطلاح ہے جس میں کافی گیرائی اور گہرائی بھی ہے اور یہ کہ اس کا تعلق بہر صورت سماج اور معاشرے سے ہے۔انسانی سماج اور معاشرے سے اس کا کوئی الگ وجود نہیں ہے۔اردو کے بڑے بڑے نقادوں اور دانشوروں نے بھی اس اصطلاح کو سوسائٹی یا سماج سے وابستہ کر کے دیکھا ہے۔اردو کے معروف نقاد اور

محقق ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی ثقافت کو معاشرے کی کوکھ سے جنم لینے والی شے قرار دیا ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

"کلچر ایک ایسی قوت ہے جو سوسائٹی کے بطن سے پیدا ہو کر باہر کو لپکتی ہے،بعینہ جس طرح بعض اوقات سوسائٹی کا ایک حصہ ،یک لخت خانہ بدوشی اختیار کر کے نئی قدروں کو وجود میں لاتا ہے۔ کلچر ایک تجربے کی مانند ہے جو زمین کو اپنی تگ و تاز کے لیے منتخب کر کے اس کی سوسائٹی کو پہلے سے زیادہ توانا،کشادہ اور گہرا کر دیتا ہے، لیکن کچھ عرصہ بعد یہی تجربہ روایت بن کر سوسائٹی سے چپک بھی جاتا ہے۔۔۔یہ تہذیب کی صورت ہے!پس تہذیب روایات،رسوم، قوانین اور آداب کا وہ جھولا ہے جس میں سوسائٹی آرام کی نیند سوتی ہے،اور کلچر،وہ روحِ بیدار ہے جو اس سوسائٹی کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگاتی ہے"(۷)

گویا ثقافت نہ صرف سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے بلکہ ثقافت سوسائٹی سے بھی بلند تر چیز ہے۔یہ فرد واحد کے تجربات سے شروع ہو کر کسی سماج یا قوم و ملت کے ان مجموعی افراد کے ان خصائص سے متشکل ہوتا ہے جو کہ بحیثیت فرد اور بحیثیت اجتماعی بیک وقت اہم، مرعوب اور دلپزیر ہوں۔ یہ اشیاء کسی بھی قوم میں ورثہ ورثہ منتقل ہوتی رہتی ہیں۔اس لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ثقفت دفعتا وجود میں آنے والی شے نہیں ہے بلکہ اسے بننے سنورنے میں وقت لگتا ہے اور بعض دفعہ تو ایک ثقافت کو مکمل ہونے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ثقافت کسی سوسائٹی یا گروہ انسانی یا قوم و ملک کی ایک نمایاں شناخت مانی جاتی ہے۔اپنے اوائل میں ثقافت کی اصطلاح کے ساتھ ایک عجیب قسم کا حادثہ پیش آیا۔ کبھی اس کو تمدن کے معنوں میں استعمال کر کے محدود کیا گیا تو سبھی اسے تہذیب کے مترادفات سمجھ کر اس کی معنوی کائنات کو مجروح کیا گیا۔ آغاز آفرینش میں اس اصطلاح کا استعمال محدود تر رہا ہے جیسے کہ ڈاکٹر نصیر احمد خان لکھتے ہیں:

"اردو میں مخصوص ثقافت کی اصطلاح کے ساتھ ایک عبرت ناک حادثہ پیش آیا ہے کہ وہ اپنے معنی کی رفعت و وسعت سے محروم ہو کر محدود و متبذل مفہوم میں استعمال ہونے لگی اور مدرسہ سے نکل کر نگار خانے میں چلی گئی،اور اس سے عموما رقص

وسرور، تمثیل نگاری، فنکاری وغیرہ مراد لی جاتی ہے۔اس طرح اس کی معنویت جو لا نگاہ سمٹ کر فنون لطیفہ تک محدود ہو گئی ہے"(۸)

بعد ازاں مختلف ماہرین اور اکابرین نے اس کی قدر و قیمت جاننے کے بعد اسے وسیع تر معنوں میں استعمال کر کے پیش کیا ہے اور یوں بعد میں یہ اصطلاح اپنے محدود دائرے سے نکل کر معاشرے اور سماج کی مختلف جہات کو اپنے اندر سمونے میں کامیاب ہوئی۔

لاہور کی مخصوص ثقافت:۔

لاہور شہر ثقافتی دارالحکومت یا پاکستان کے مرکز کے طور پر جانا جاتا ہے۔یہ شہر مغل دورِ حکومت اور سکھوں کے دورِ حکومت کے ساتھ محمود غزنوی کی گیارہویں صدی کے سلطنت میں بھی پنجاب کا دارالحکومت رہا ہے۔

اس وقت یہ پاکستان کے سب سے بڑے صوبہ پنجاب کا دارالحکومت ہے۔لاہور شہر نے پاکستانی تاریخ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے ۔ آزادی سے قبل سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی بڑی تعداد اس شہر میں مقیم رہی۔ آزادی کے وقت بغاوتوں، مظاہروں اور بہت بڑی خونریزی کا سامنا کرنا پڑا جس کی بڑی وجہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی دشمنی تھی۔اس غیر یقینی صورتحال نے آزادی کے بعد بھی لاہور پر قابو پالیا تھا۔

لاہور شہر اپنی منفرد خصوصیات اور ممتاز خطوخال کی وجہ سے الگ حیثیت کا حامل شہر ہے جس کے گلی کوچوں کی زبان، تاریخی عمارات، باغات، قلعے ،مساجد اور بازار اپنی پر رونق مقامیت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔لاہور کے سری پائے، حلوہ پوری، فالودہ لنڈا بازار ،ہیرا منڈی ،مینارِ پاکستان، بھاٹی گیٹ گنگا رام ہسپتال، گلاب دیوی، پنجاب یونی ورسٹی اور مال روڈ ایسے مقامات ہیں جنہیں کی پہچان قرار دیا جا سکتا ہے۔ پنجاب کا دارالخلافہ لاہور ہے۔ اس لیے لاہور کو نظر انداز کر کے پنجاب کی ثقافت کو زندہ کرنے کی تمام کوششیں ماضی میں ناکام ہوئی ہیں۔ یہ بات غلط نہیں ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس لیے لاہور کو دیکھنے کے قابل رکھنا حکومت کی بنیادی

ذمے داری ہے۔ ماضی کی حکومتوں نے بھی لاہور پر کافی توجہ دی ہے۔ لیکن پھر بھی اس توجہ کا بنیادی نقطہ میگا منصوبے تھے۔ اسی حوالے سے عتیق انور راجہ لکھتے ہیں:

"پچھلے دنوں لاہور میں اچانک ایک تقریب میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں صوبائی وزیر ثقافت خیال احمد کاستر و مہمان خصوصی تھے۔ پنجاب کی بات ہو اور پنجابی ثقافت کا ذکر چلے تو میرے قدم خود بخود اس تقریب کی طرف چل پڑتے ہیں۔ تقریب بہت اچھی تھی۔ پنجابی ثقافت کے سارے رنگ نظر آرہے تھے کہ مہمان خصوصی خیال احمد کاستر و کو خطاب کے لیے ڈائس پر بلایا گیا۔ بہت مدت کے بعد ایسا لگا کہ اس منصب پر تعینات ہونے والے کسی صاحب کو واقعی اپنی ثقافت کی سوجھ بوجھ ہے اور ان کے لفظوں کی ادائیگی سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ صاحب کا ذوق بھی بہت اچھا رہا ہو گا۔ یعنی کاستر و صاحب کے پاس اچھی کتب ضرور ہوں گی۔ جن کے مطالعے نے ان کے الفاظ کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تقریر کیا تھی لگ رہا تھا جیسے بہار کے موسم میں نئی کونپلیں کھل رہی ہیں اور تقریر سنیں تو لگتا ہے پھول جھڑ رہے ہیں۔ شائستگی آداب اور تہذیب سے ہم آہنگ ایک ایسا انسان جو مٹی سے مکمل طور جڑا ہوا ہو۔ ایک ایسا بندہ جو وسائل اور مسائل کی برابر سمجھ رکھتا ہو۔ ایک ایسا بندہ جسے احساس ہے کہ کسی بھی قوم کا کلچر اسے نہ صرف دنیا میں پہچان دیتا ہے۔ بلکہ کلچر کی ترقی اصل میں قوم کی ترقی بن جاتی ہے۔ انہیں دیکھ کے اور ان کی تقریر سن کے ایسا لگتا ہے کہ جناب اپنے کلچر کی تجدید کے لیے جامع پلان رکھتے ہیں۔ ہم سب ہی جانتے ہیں کہ ثقافت

کسی بھی ملک کی شناخت دوسرے ملکوں کو کراتی ہے۔اس وقت دنیا کے بہت سے ملک اپنی ثقافت کو ترقی دے کے سالانہ کروڑوں ڈالروں سے اپنے خزانے بھر رہے ہیں"(۹)

اسی طرح پاکستان میں کلچر کے فروغ کے لیے حکومت کس حد تک کوشاں ہے اس کی خوبصورت تصویر عطاالحق قاسمی یوں پیش کرتے ہیں:

"پاکستان میں پاکستانی کلچر کے فروغ کے لیے بہت سے ادارے اور این جی اوز کام کر رہی ہیں۔اس ضمن میں مجھے جو بات بہت اچھی لگی وہ یہ تھی کہ ان اداروں کے منتظمین کا کوئی تعلق پاکستانی کلچر سے نہیں تھا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کلچر میں پرورش پانے والا شخصاپنے کلچر کو اتنا نہیں سمجھ سکتا جتنا دور سے نظارہ کرنے والا شخص سمجھ سکتا ہے"(۱۰)

کسی بھی معاشرے کی ثقافت میں لباس،زبان،مذہب،خوراک،رنگ و نسل اور معاشرت جیسے مظاہر کارفرماہوتے ہیں۔اس عناصر کے بغیر ثقافت کا تصور کرنا محال ہے۔ان عناصر کی روشنی میں دیکھا جائے تو لاہوری اردو زبان کی بجائے عوامی سطح پر پنجابی بولتے نظر آتے ہیں۔گاڑیوں میں خوانچہ فروشوں، چھابڑی فروشوں اور اس طرح کے کرداروں کی متنوع اقسام جلوہ افروز ہوتی ہیں جن کی زبان دیگر شہریوں سے خاصی مختلف ہوتی ہے۔ب کی جگہ پ کا لفظ لاہوری پنجابی کی خاص علامت ہے جیسے بہن کی جگہ پین اور بھائی کی جگہ بائی کا لفظ بولا جاتا ہے۔اگر لاہوری ثقافت کی بات کی جائے تو شلوار قمیض لباس یہاں کی عام ملبوسی شکل ہے تاہم جدیدیت اور وعالمیت کے

اثرات کے تحت اب کراچی کے بعد لاہور ایسا شہر بن چکا ہے جہاں جینز کے ساتھ تنگ پاجامے اور لمبی قمیضوں کا رواج عام ہوتا جارہا ہے۔لاہوری کلچر میں چھلڑ اور ثقافت کے الفاظ اپنی مقامیت کی وجہ سے دلچسپی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ۔مرد و زن کا اختلاط یہاں معمول کی بات ہے ۔دکانیں اور کلب رات کو دیر تک کھلے رہتے ہیں ۔لاہوری لباس کے حوالے سے عطاالحق قاسمی لکھتے ہیں:

"میں نے لوگوں کو یہاں ملکی اور غیر ملکی لباس دونوں میں دیکھا ہے۔مجھے معلوم ہوا کہ جو پڑھے لکھے لوگ ہیں وہ غیر ملکی لباس پہنتے ہیں اور جو ان پڑھ لوگ ہیں وہ اپنے ملک کے لباس کو ترجیح دیتے ہیں۔دوسرے درجے کے لوگوں میں دھوتی ایک مقبول اور پسندیدہ لباس ہے۔یہ ایک ان سلے کپڑے پر مشتمل ہوتا ہے جسے لوگ اپنی کمر پر باندھ لیتے ہیں کئی لوگ رات کے وقت بھی دھوتی باندھ کر سوتے ہیں اور بہت ہی گہری نیند سوتے ہیں۔میں ایک دوست کے گھر مہمان گیا تو اس نے بھی سوتے وقت مجھے ایک دھوتی باندھنے کے لیے دی،جب صبح ہوئی تو وہ دھوتی میں نے اوپر لی ہوئی تھی"(۱۱)

لاہور شہر کی ثقافت اس کی تاریخ، کھانوں،لباس،اداروں،میلوں ٹھیلوں، فلموں،موسیقی، فیشن اور آزاد خیال معاشرتی طرز زندگی پورے ملک سے لوگوں کو اپنی جانب راغب کرتا ہے۔ مغل آرٹ اور فن تعمیر لاہور شہر کے تاریخی ورثے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ورثے میں عربوں،پارسیوں، آریائیوں،یونانیوں اور سکھوں کا بھی بڑا اہم کردار ہے۔ بادشاہی مسجد،وزیر خان مسجد،نور جہاں کا مقبرہ،لاہور میوزیم،انارکلی کا مقبرہ، جہانگیر کا مقبرہ،چار مینار،چوبرجی اور باغ جناح لاہور شہر میں پائے جانے والے کچھ بڑے فن تعمیرات ہیں۔

باقی دنیا سے لاہور کو مساجد، محلات، حویلیوں، قلعوں اور مدارس وغیرہ کی وجہ سے لوگ جانتے ہیں، دور جدید میں لاہور شہر میں بحریہ ٹاؤن ہاؤسنگ سکیم کی آرٹ اور سجاوٹ کے بعض حصے قدیم مصری تہذیب کا عکس معلوم ہوتے ہیں، ان میں دیگر بہت ساری چیزیں قدیم ثقافتوں سے تعلق رکھتی ہیں جو کہ لاہور کی پہچان میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ لاہور شہر کے اندر مساجد کی بہتات ہے۔ لاہور شہر اپنی مساجد اور فن تعمیر کے حوالے سے دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔ اس حوالے سے عطاالحق قاسمی لکھتے ہیں:

> "استنبول کے بعد لاہور دوسرا بڑا شہر ہے جسے مساجد کا شہر کہا جاتا ہے۔ مسجد کسی بھی خالی پلاٹ پر اس کے مالک کی مرضی کے بغیر بنائی جاسکتی ہے۔ جب ایک دفعہ مسجد بن جائے کوئی مائی کا لال اس کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں لب کشائی نہیں کر سکتا۔ ان مسجدوں میں اہل محلہ کے اعصاب کو مظبوط بنانے کے لیے چاروں طرف لاؤڈ اسپیکر لگا دیے جاتے ہیں تاکہ کسی کافر ملک سے جہاد کی صورت میں عوام بموں کے دھماکوں سے پریشان نہ ہوں"(۱۲)

لاہور شہر چونکہ پاکستانی ثقافت کا حب مانا جاتا ہے اس لیے ورلڈ میر فارمنگ آرٹ فیسٹیول نومبر کے مہینے میں الہمبرا ثقافتی کمپلیکس میں منعقد کیا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا فیسٹیول ہوتا ہے جو دس روز تک جاری رہتا ہے۔ ان دس دنوں میں فیسٹیول میں تھیٹر، موسیقی کی محافل، موسیقی، سولو، ڈانس، مجرا اور کٹھ پتلی شوز کئے جاتے ہیں۔ اس فیسٹیول میں ۸۰ فیصد تک بین الاقوامی فنکاروں کے ذریعے مختلف قسم کے شوز پیش کئے جاتے ہیں۔ لاہور شہر پاکستان کی کٹھ پتلی صنعت کا بڑا اہم مرکز ہے۔ سال میں ایک دفعہ یہ کٹھ پتلی فیسٹیول لاہور میں منایا جاتا ہے۔ دوسری جانب آزاد تھیٹر اور اجوا کا تھیٹر پاکستان کے اندر تھیٹر کی صفِ اول کی کمپنیاں ہیں۔ لاہور کو تہذیب و فن کا مرکز مانا جاتا ہے اس حوالے سے عطاالحق قاسمی لکھتے ہیں:

> "لاہور تہذیب و فن کا مرکز ہے، چناچہ ملک بھر سے مختلف فنون کے ماہر یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ آرٹ کے جن نمونوں کو ہمارے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جن کی تعریف میں ناقدین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ لاہور میں اس آرٹ کے ماہرین ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں"(۱۳)

اس کے علاوہ شہر کے اندر متعدد آرٹ گیلریاں موجود ہیں جن میں ثقافتی رنگوں سے مزین شوز پیش کئے جاتے ہیں۔ لاہور شہر نے متنوع قسم کی موسیقی کو بھی جنم دیا۔ لاہور شہر کی موسیقی میں استاد نصرت فتح علی خان اور ابرار الحق کے پنجابی گیت پاکستانی پاپ سنسنی خیز قوالیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ نور جہاں، استاد امانت علی، فریدہ خانم، علی ظفر، استاد سائیں، سائیں ظہور اور اسی طرح بے شمار گیت نگار لاہوری ثقافت کی ترجمانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

برِ صغیر کے اندر اپنے مجرا رقص کی وجہ سے لاہور شہر اپنی ایک الگ خاصیت رکھتا ہے۔ اس کا آغاز مغل دور حکومت میں ہوا لیکن موجودہ دور میں یہ رقص لاہور کی پہچان ہے۔ لاہور شہر کے باسی کھانے پینے سے بے حد پیار کرتے ہیں اور پوری دنیا میں لاہوری کھانے اپنی لذت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ جبکہ لاہور کے اندر روایتی اور دور جدید کے ریستوران بھی موجود ہیں۔ موجودہ دور کے مغربی فاسٹ فورڈ، چائنیز، پیزا ہٹ، ڈومینوز، چکن رائیس، سینڈوچ، ڈکن آرٹس کی دکانیں پورے شہر میں بن چکی ہیں۔ پاکستان کے اندر کلچر کے حوالے سے ڈاکٹر انور پاشا لکھتے ہیں:

> کلچر اور فنون کے بارے میں ایک تو ہمارا تصور یہ ہے کہ یہ تو امراء کی عیاشی کی چیز ہے، وہ کریں تو ٹھیک ہے دوسرے لوگوں کا اس سے کیا واسطہ۔ اس سے ملتی جلتی بات قدرے مختلف انداز میں میں نے کچھ پہلے اسلام آباد میں سنی۔ کوئی صاحب اپنے کسی ثقافتی منصوبے کے سلسلے میں ایک درخواست لے کر کسی وزارت میں پہنچے۔ انہیں اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لئے کچھ پیسے درکار تھے۔ وہاں انہیں جواب ملا، ہمارے پاس ایگریکلچر کے لیے روپیہ نہیں ہے اور تم کلچر لیے پھرتے ہو۔ یہ کلچر ولچر رکھو اپنے پاس روٹی کپڑا مکان اور دوسری ضرورتیں پوری ہونے کے بعد پیسہ آئے گا تو اس وقت بات کریں گے۔ یہ ضروریات پوری کر لیں اس کے بعد کلچر سے بھی نمٹ لیں گے "(۱۴)

اسی طرح ڈاکٹر سید عبد الطیف پاکستانی کلچر کے حوالے لکھتے ہیں:

"یہ نئی طرزِ زندگی، نئی طرز کی معاشرت پیدا کرنے کا سبب بنی جو نہ خالص ہندو ثقافت تھی نہ خالص اسلامی ثقافت بلکہ دونوں کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ تھی۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو یہی ہندو مسلم تہذیب و ثقافت وہ چیز ہے جو آج پاکستان کا ایک باعث صد افتخار اثاثہ ہے"(۱۵)

لاہوری کلچر بھی بالکل اسی طرح کئی شہروں کے لوگوں کی زندگیوں کا مرکب نظر آتا ہے۔ جیسے بڑے بڑے ممالک میں جدید قسم کے ریستوران اور کھانے کی کئی ڈشیں متعارف کروائی جارہی ہیں اس کی مثالیں لاہور میں بھی بے شمار ملتی ہیں۔ حال ہی میں گوالمنڈی، اردو بازار، انارکلی اور آزادی چوک میں لاہور کے تاریخی مقامات پر یہ کھانے سیاحوں کو کو بڑی تعداد میں اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔ کھانے کی گلیوں کو شام کے وقت پیدل چلنے والے گھیر لیتے ہیں اور ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔ متعدد علاقوں میں بہت سی دکانیں مقامی کھانے پیش کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ لاہور پاکستان کا وہ شہر ہے جس کی ثقافت تہواروں' کھانوں' ملبوسات اور قدیم مقامات سمیت اپنے اندر ہزاروں رنگ سموئے ہوئے ہے۔ لاہوری ثقافت دنیا کی تاریخ میں سب سے قدیم ترین ثقافتوں میں شمار ہوتی ہے۔ ثقافتی، تاریخی، مذہبی اور جغرافیائی طور پر لاہور شہر اپنے اندر ہر وہ کشش رکھتا ہے جو ایک سیاح کو اپنی طرف کھینچ لے یعنی لاہور میں تاریخی قلعے ہیں، دریا ہیں۔ خوبصورت باغات ہیں اور پنجاب اپنے صحت بخش اور مزیدار کھانوں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ لاہوری لوگ کھانے بنانے اور کھانے کھانے میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ لاہوری کھانے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ لاہوریوں کے خوش خوراک ہونے کے حوالے سے عطا الحق قاسمی لکھتے ہیں:

"لاہور کے لوگ کھانے پینے کے بہت شوقین ہیں، انہیں جب کھانے پینے سے فراغت ملتی ہے تو پھر کھانے پینے لگتے ہیں۔۔۔ لاہور کے لوگ کھانا پینا تب چھوڑتے ہیں جب تھک جاتے ہیں"(۱۶)

سادہ چاول، لاہوری سری پائے وغیرہ کی سہولت لاہور کے بہت جدید ترین رستورانوں میں موجود ہے جو گلبرگ ایم ایم روڈ پر مرتکز ہیں۔ حالیہ دنوں میں لاہور شہر کے اندر مسلسل ریستوران کھل رہے ہیں اور لاہور کے اندر یہ ریستوران رات گئے تک کھلے رہتے ہیں۔ پیزا ہٹ اور میکڈونلڈ کی کچھ شاخیں چوبیس گھنٹے کھلی رہتی ہیں اور ہوم ڈلیوری کی سہولت بھی دے رہی ہیں۔ لاہور ہوٹلوں کا شہر کہلاتا ہے اور لاہور کی نفسیات ہوٹلوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اس شہر کا ہر ہوٹل اپنی جگہ پر ایک انسٹی ٹیوشن ہے، ایک مکمل سکول آف تھاٹ ہے۔ ان ہوٹلوں میں ٹی ہاؤس ہے، کافی ہاؤس ہے، میٹرو ہے، میکلوڈ کے ہوٹل ہیں، سرکلر روڈ، لاہوری گیٹ، بھاٹی گیٹ، اور چوک گوالمنڈی کے ہوٹل ہیں مال میکلوڈ کے ہوٹلوں میں بیٹھنے والے لوگ ہیں جو نئی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ لاہور کے ہوٹلوں کے حوالے سے اے حمید لکھتے ہیں:

> "یہ ہوٹل پرانے اور نئے شہر کے درمیان چھوٹے چھوٹے غیر قانونی جزیروں کی طرح آباد ہیں۔ یہاں ہر ٹائپ کے لوگ آکر بیٹھتے ہیں۔ یہ نئے اور پرانے لاہور کے درمیان فری پورٹ کی حیثیت رکھتے ہیں"(۱۷)

قومی چھٹیوں کے دوران میں مکانات اور سڑکوں کو روشن کرنے کے لئے لوگ مصنوعی روشنیوں کا خوبصورت بندوبست کرتے ہیں۔ سڑکیں اور مکان رات سے دن تک روشن رہتے ہیں۔ حضرت علی ہجویری کا مقبرہ جسے داتا گنج بخش یا داتا صاحب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے لاہور شہر میں واقع ہے اور ایک بڑے تہوار کا سالانہ عرس منایا جاتا ہے۔ بسنت بھی لاہر میں منایا جانے والا تہوار ہے جو موسم بہار کی آمد دسے شروع ہوتا ہے۔ پاکستان میں بسنت کی تقریبات لاہور سمیت ملک بھر میں سالانہ تقریبات کے لیے بیرون ملک سے بھی لوگ آتے ہیں۔ بسنت کے دنوں میں شہر کے مکانوں کی چھتوں پر پتنگ بازی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ لیکن حالیہ دہائی میں ہلاکتوں اور بجلی کی تنصیبات کے نتیجے میں ہونے والے نقصان کی وجہ سے عدالتوں نے بسنت پر پابندی عائد کر دی ہے۔

میلہ چراغاں لاہور کا ایک اور مقبول ترین میلہ ہے جو مارچ کے آخری ہفتے میں جمعہ کو موسم بہار میں منایا جاتا ہے۔ گھوڑوں اور بیلوں کی دوڑ کے حوالے سے زیادہ مشہور تہواروں میں سے ایک ہے جو موسم بہار میں

فورٹریس اسٹیڈیم میں منعقد ہوتا ہے۔ ہفتے بھر کی سرگرمیوں میں مویشیوں کی نمائش ،اونٹ کے رقص اور گھوڑے کے رقص لیے پاکستان کے تمام خطوں سے لوگ آتے ہیں۔لاہور کو میلے اور تہوار منانے والوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ یہاں ہر شخص ملکی اور قومی تہواروں میں اپنا حصہ ضرور ڈالتا ہے اور تمام تہوار بڑے اہتمام سے مناتے ہیں میٹھی عید کا دن لاہور شہر کے اندر بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ تہواروں کے منانے کے حوالے سے اے حمید لکھتے ہیں:

> "عید کا تہوار لاہور میں بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ایک ماہ کے کڑے امتحان سے گزرنے کے بعد عید کا دن نتیجہ نکلنے کا دن ہوتا ہے اور اس دن کوئی فیل نہیں ہوتا"(۱۸)

چودہ اگست کو پاکستانی عوام یہ دن جشن آزادی کے طور پر مناتے ہیں۔ لاہور میں اس حوالے سے بے شمار تقریبات ہوتی ہیں۔ لاہور شہر کی سڑکیں ناچ گانا کرنے والے لوگوں سے بھر جاتی ہیں اور پاک فوج کے کی پریڈ صبح سات بجے سے شروع ہو جاتی ہیں۔

لاہور شہر کے شاپنگ مالز میں غیر ملکی فیشن کے ساتھ ساتھ پاکستانی فیشن لیبل موجود ہیں ۔پیس ایک مقبول شاپنگ سینٹر ہے جو گلبرگ میں واقع ہے۔ اسی طرح اور مشہور شاپنگ مالز اور مارکیٹ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں ہیں۔ ایچ بلاک اور وائی بلاک مارکیٹوں اور فورٹریس اسٹیڈیم کے علاوہ گلبرگ ایم ایس روڈ،ماڈل ٹاؤن،ایم ایم عالم روڈ اور اسی طرح کے بے شمار مالز لاہور میں بن گئے ہیں۔

لاہور شہر میں رات گئے تک شاپنگ سینٹرز اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں اور لوگ یہاں پر شاپنگ کے لیے جس وقت مرضی آئیں انہیں یہ سہولیات دستیاب ہوتی ہیں۔ لاہور شہر کے فیشن فنکاروں میں ڈیزائنرز اور ماڈلز کام کر رہے ہیں۔ جن میں ایمان علی، شفیق بٹ، میشا شفیع ایمان علی شامل ہیں۔ لاہور میں فیشن کے حوالے سے ہفتے کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ لاہور سے ماڈل صرف قومی حدود میں ہی محدود نہیں بلکہ بین الاقوامی مقابلوں میں بھی نمودار ہوتے ہیں۔ لاہور میں پاکستان اسٹیٹ آفس اینڈ سنز اور لاہور اسکول آف فیشن ڈیزائن جیسے فیشن اداروں کا گھر بھی ہے۔

لاہور اور ادب ایک ایسا حسین امتزاج ہے جس کی تاریخ پرانی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔اے حمید نے ان یادوں کو بڑے احسن انداز میں بیان کیا ہے۔پارک کی یادیں ،انجمن پنجاب، نیاز مندان لاہور، اور زندہ دلان لاہور ان جیسی اور تراکیب اپنی تہذ ہبی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر رکھتے ہیں۔اس حوالے سے اے حمید لکھتے ہیں:

> "ایک شام لارنس باغ کے اوپن ایئر کیفے میں پاکستان ہیلتھ کلب کے کارنر پر دازان ملک اسلم حیات اور اقبال کی جانب سے لاہور کے ادباء اور شعراء اور دیگر ممبران کو ڈنر دیا گیا۔ادباء اور شعراء میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ موجود تھے۔ان میں احمد ندیم قاسمی ،قتیل شفائی، ظہیر کاشمیری، قیوم نظر، شہرت بخاری، عارف عبدالمتین وغیرہ سبھی شامل تھے۔ترقی پسند گروپ ایک طرف بیٹھا تھا اور حلقہ ارباب ذوق گروپ اسٹیج کے پاس کرسیوں پر براجمان تھا"(۱۹)

اردو ادب میں جتنے بھی شاہکار لکھنے والے گزرے ہیں وہ جتنے زیادہ اپنی تخلیق کے فن اور تکنیک کی معلومات اور اسے برتنے کے ہنر میں مہارت رکھتے تھے اس سے کہیں زیادہ وہ اپنی ثقافتی ،سیاسی، سماجی اور عصری زندگی کی رنگینیوں سے آگاہی رکھتے تھے۔ان بڑے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا مشاہدہ کریں تو ہمیں جہاں فنی خوبیاں نظر آتی ہیں وہیں اپنے عہد کی زندگی اور زمانے کی عکاسی کے پہلو بہ پہلو سماجی، معاشرتی اور تہذیبی و زز ثقافتی کو بیان کرنے کا سلیقہ بھی نظر آتا ہے۔مسجد ،مندر، کلیسا، گردوارہ، گاؤں اور شہر کی گھریلو زندگی، امیروں اور غریبوں یا نچلے طبقے کی زندگی گزارنے کا دھنگ اور رہن سہن،،ختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے عقائد اور رسومات غرض ہر وہ چیز جس کا تعلق قوم و ملک کی ثقافتی زندگی سے ہے۔

ناول جو زندگی کے حقیقی عکاس اور ترجمان ہوتے ہیں۔ان ناولوں کو اگر دیکھا جائے تو بیشتر ناول اپنی ثقافتی خمیر کے ہی مظہرات معلوم ہوتے ہیں۔افسانہ اگر زندگی کے کسی ایک پہلو کا احاطہ کرتا ہے تو ناول بیک وقت زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمیٹتا ہے۔یہاں زندگی کے کئی ایک گوشوں کو جزئیات اور تفصیلات سے بیان کی نجائش موجود رہتی ہے۔اسی طرح عاصم بٹ نے بھی اپنے ناولوں میں ثقافتی عناصر کی وسیع پیمانے پر ترجمانی کی ہے۔

عاصم بٹ خوش فکر نوجوان تخلیق کار ہیں جنہوں نے لاہور کی زمین سے جڑ کر مقامیت کی فضا میں رہتے ہوئے لاہوری ثقافت اور سماج کو اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔ اگر چہ دیگر ادیبوں نے بھی سفر ناموں اور دیگر اصناف میں لاہور کو موضوع بنایا ہے تاہم عاصم بٹ نے اپنے منفرد اسلوب اور حقیقی لاہوری زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے کہیں اسے محبت کی زبان میں بیان کیا ہے تو کہیں فرد کے داخلی انتشار کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے صدف نقوی لکھتی ہیں:

> "محمد عاصم بٹ نے اس ناول میں لاہور کی تہذیب، اندرون شہر کی تنگ و تاریک فضا، محبت کے دعویداروں کی مکاریاں اور عیاریاں اور معصوم لڑکیوں کے بہکاوے میں آنے کے موضوعات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے"(۲۰)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو انہوں نے ثقافتی پہلو کو تاریخ کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا ہے۔ ہمیشہ سے ثقافتوں نے تاریخ میں ہی اپنے سفر کو طے کیا ہے اس واسطے تاریخ اور ثقافت کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ باہم لازم و ملزوم ہیں۔ محمد عاصم بٹ نے کہیں ٹکسالی دروازہ، لاہوری دروازہ، انار کلی، اردو بازار اور کہیں ہیرا منڈی جیسے طوائف خانے کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بات کی اہمیت کی حامل ہے کہ کاشان پلازہ، بسم اللہ سٹور، سبلائم سٹوڈیو جیسی جدید طرز کی عمارات اور مقامات جو کہ مقامیت کی علمبر دار اور لاہور کی پیداوار ہیں ان کے ناولوں میں اپنی اہمیت رکھتی ہیں۔ مصنف نے اس طرح ان موضوعات کو تحریر کے ساتھ مربوط کیا ہے کہ باہم یکدگر ہو کر اپنے ارتقائی مراحل کو طے کرتے ہیں۔ دیگر ادیبوں نے ادب خانوں، ٹی ہاؤس، سینیما گھروں یا مشہور تاریخی مقامات پر زورِ قلم آزمایا ہے۔ عاصم بٹ کی یہ انفرادیت ہے کہ انہوں نے لاہوری ثقافت کے ساتھ جڑی عام جگہوں کا انتخاب کیا اور

ایسی جگہوں کو ناول میں جگہ دی جہاں عام لکھاری کی نظر نہیں جا پاتی۔لاہور اب ایسا خطہ زمین نہیں رہا جہاں صرف تاریخی نمونے ہی رکھے ہوں بلکہ جدت کا حامل ایک قدیم شہر ہے جسے یونیسکو نے طبافی کے میدان میں بھی اپنی جاری کردہ فہرست میں جگہ دی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سوم آنند، لاہور کی باتیں، مکتبہ جامعہ، نئی دلی، ۱۹۸۱ء، ص، ۶

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۴۴

۳۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، کلچر کا مسلئہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱

۴۔ فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، س ن، ص ۹۰

۵۔ انسائکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز، ص ۶۲۱

6.The national culture .S.Abid Hussain ,national book trust,india edition 2003,p,03

۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، غفیف پرنٹرز، دہلی، ۲۰۱۴، ص ۳۳

۸۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر، اسلامی ثقافت، شیخ محمد عثمان اینڈ سنز، سری نگر، 3۲۰۰، ص ۴۳

۹۔ عتیق انور راجہ، پنجاب کی ثقافت اور وزیر ثقافت، ایکسپریس، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص ۹

۱۰۔ عطاالحق قاسمی، غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص 118

۱۱۔ ایضا، ص ۴۶

۱۲۔ ایضا، ص 87

۱۳۔ ایضا، ص ۵۵

۱۴۔ انور پاشا، ڈاکٹر، ہندو پاک میں اردو ناول تقابلی مطالعہ، پیش رو پبلی کیشنز، نئی دلی، ۱۹۹۲، ص ۶۳

۱۵۔ سید عبدالطیف، ڈاکٹر، تاریخ ثقافتِ ہند، انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز، حیدرآباد، ۱۹۶۷ء، ص ۳۶۵

۱۶۔ عطاالحق قاسمی، غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۷۶

۱۷۔ اے حمید، لاہور کی باتیں کچھ نئی کچھ پرانی، خورشید مقبول پریس، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۹

۱۸۔ ایضا، ص ۷۶

۱۹۔ ایضا، ص ۹۳

۲۰۔ صدف نقوی، محمد عاصم بت کی ناول نگاری، (مضمون) مطبوعہ، ادبی ادارہ نقاط، فیصل آباد، ۲۰۱۳، ص ۵

باب سوم:

محمد عاصم بٹ کے ناولوں "دائرہ" اور "بھید" میں لاہور شہر کے مقامات: تجزیاتی مطالعہ

ناول "دائرہ" میں لاہور شہر کے مقامات کا تجزیہ:

کسی بھی شخص کی ذات کا اظہار تقریر سے اور تحریر سے ممکن ہے۔ بعض اوقات محرر اپنی تحریر کی صورت میں خود بول رہا ہوتا ہے اور بعض اوقات لکھنے والا خود کردار میں ڈھل جاتا ہے اور اپنی ذات کی نفی کر کے اس کردار کے روپ کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ عاصم بٹ ایسے لکھاری ہیں جو کہ "مقامیت" اور "حقیقی کردار نگاری" سے بھرپور تحریر لکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں سے ایک شاہکار تحریر "دائرہ" ایک ایسا ناول ہے جس میں انہوں نے کردار کے ساتھ مکمل انصاف کیا ہے اور لاہور جیسے شہر بے مثال کی تہذیب و ثقافت کو مختلف پہلوؤں سے بیان کیا ہے۔

قاری کا ربط نہ صرف تحریر کے تسلسل کے ساتھ قائم رہتا ہے بلکہ نفسیاتی طور پر قاری ان حالات اور واقعات کو انسانی زندگی سے ہم آہنگ پاتا ہے۔ کردار کے ساتھ پیش آنے والے حوادث ہوں یا مختلف مقامات کی منظر نگاری عاصم بٹ ہر دو مقامات پر کامیاب لکھاری نظر آتے ہیں۔ جیسے کہ مستنصر حسین تارڑ نے لکھا ہے کہ اس کے ناولوں کے قبضے میں جو کردار ہیں وہ اتنے منہ زور ہیں کہ فکشن کے میدان میں بگٹٹ بھاگتے ہیں۔

اسی طرح آگے چل کر لکھتے ہیں کہ وہ ناول کے میدان میں آئندہ کسی کو بھی زیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ گو کہ مصنف جس کردار کو پیش کرتے ہیں اس کے معاشرتی مقام، ارد گرد کی فضا، اس کے رہن سہن اور آداب بلکہ ہر عنصر کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ "دائرہ" کے کردار اور مکانی عناصر شہر لاہور کے گرد کثرت سے قائم رہتے ہیں بلکہ "دائرہ" کو لاہوری زندگی کا ملخص قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ناول کے بلکل آغاز میں لاہور شہر کے پارکوں کی منظر کشی کرتے ہوئے اقبال پارک کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

"پاس ہی پیراشوٹ کے کپڑے کا کسی طرح کا سامان کا بھرا تھیلا بھی گھاس پر پڑا تھا جو تیز روشنی میں دودھیا معلوم ہو رہی تھی۔ چپس کے خالی پیکٹ، بجھے ہوئے سیگرٹوں کے ٹکڑے اور ڈبیاں، مڑے تڑے کاغذ اور ایسا ہی بیکار سامان ہر طرف بکھرا پڑا تھا"(۱)

اگر اس اقتباس پر غائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ کس طرح لاہور جیسے شہر میں لوگ جوق در جوق پارکوں کا رخ کرتے ہیں اور زندگی کے بھرپور لمحات کا لطف اٹھانے کے بعد فالتو اور بے کار اشیاء ہی نہیں بلکہ کھانے پینے کی باقی ماندہ اشیاء کو بھی پارکوں اور تفریحی مقامات پر پھینک دیا جاتا ہے جس سے ماحولیاتی آلودگی کا توازن بگڑتا ہے اور صحت کے مسائل جنم لیتے ہیں۔

"دائرہ" میں پیش کیے گئے مختلف مقامی چوکوں، بازاروں، مزاروں اور اداروں کا ذکر اس انداز میں کیا گیا ہے کہ قاری لاہور کی شاہراہوں پر چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور وہی محسوس کرتا ہے جو کہ کردار کو در پیش ہوا ہے۔ سید مٹھا بازار، ٹیکسالی دروازہ، لاہوری دروازہ، انارکلی، رشید ٹی سٹال، چاچے دا چھابا اور ڈیوچے بینک روڈ جیسے مقامات پیش کر کے مصنف نے مقامی ثقافت اور علاقائی مکاش کو بدرجہ اتم احاطہ تحریر میں لانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ دوسری طرف زمان خان، نورین، آصف اور نیاز بیگ وغیرہ جیسے کردار جو کہ لاہور کی دھرتی سے جڑے ہوئے ہیں ان کے تمام خصائص اور خوبیوں، خامیوں سے متسف ہونے کے ساتھ ساتھ تحریر کے پردے میں جب گفتگو یا کوئی عمل کرتے ہیں تو لاہور سراپا کردار نظر آتا ہے۔

مذکورہ بالا مقامات اور کرداروں کے پس منظر میں عاصم بٹ نے کمال چابکدستی سے لاہور کی علاقائی تہذیب کو بطریق احسن لفظی تجسیم دی ہے جو کہ ایک کمال فن کی علامت ہے۔ کرداروں کے مکالمے اور معاشرتی زندگی میں ان کا کردار لاہور کی منہ بولتی تہذیب و ثقافت کا بیان ہے۔

اگرچہ اے حمید، مستنصر حسین تارڑ اور خالد رؤف جیسے لکھاریوں نے بھی لاہور شہر کو موضوعِ سخن بنایا ہے لیکن جس طریقے سے عاصم بٹ نے اپنے کرداروں اور علاقائی مقامات کی مدد سے لاہور شہر کو پیش کیا ہے۔ یہ انہیں کا خاصہ ہے۔ کسی بازار کا ذکر کرتے ہیں تو اردگرد کی فضا اور رش میں چلنے والے لوگوں کا حلیہ اور گردونواح

میں موجود دکانوں اور دکان داروں کا ہی نہیں بلکہ ساکن تیار کھڑے گاہکوں اور ان کی گفتگو باہم کو پیش کرتے ہیں جیسا کہ ایک سلسلہ ہے معاشرت کا جو مصنف کے سامنے روزمرہ کی زندگی کے عام مشاہدے کی بات ہے۔

کردار جب محوِ کلام ہوتا ہے تو انگلیوں کی حرکت، چہرے مہرے کا شبیہہ، آواز، لفظوں کا چناؤ، لہجے کی برہمی اور خود سپردگی و بے زاری، ذہنی کشمکش، معاشرتی دباؤ، خود بے زاری، نفسیاتی خواہش کا اختلال، خیالات کی قلمونی اور رخساروں کی رنگت کو پیش کرتے ہیں جو کہ کردار کی کلام کے وقت داخلی اور خارجی کل ہئیت و حرکت کا بیان ہے۔ سید مٹھا بازار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "سید مٹھا بازار میں تعزیے والی دکان کے سامنے کباڑیے کی ہٹی تھی"(۲) اور اسی مقام پر آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "کوئی ریڈھا یا غلاظت سے لدی ہوئی گدھ عموما اس کے آگے کھڑی ملتی جس سے اس کا ماتھا، جو پہلے ہی بہت تنگ تھا، نظروں سے یکسر اوجھل ہو جاتا۔ اس کے صحیح مقام کو یاد رکھنے کی نشانی تعزیے والی دکان تھی جہاں محرم کے مہینے میں ہی نہیں سارا سال تعزیے، علم ،پنگھوڑے بنتے رہتے تھے۔ رنگ برنگی کاغذ کی پنوں، چمکتے ہوئے کپڑوں کی کترنوں، زرد اور سفید تنکو ں، رنگدار دھاگوں، سنہری جھالروں ،پیتل اور سلور کے چھوٹے چھوٹے میناروں، گنبدوں اور ستونوں سے بنے ہوئے یہ تعزیے بچوں کے لئے ہر طرح کی دلچسپی کا مرکز ہوتے "(۳)

اقتباس مذکورہ بالا کو پیش نظر رکھ کر لاہور کی جغرافیائی ساخت اور اس کے بازاروں میں محرم کے مہینے میں مخصوص دکانوں پر کیا سماں ہوتا ہے اس کو بخوبی بیان کیا گیا ہے جیسا کہ قاری خود خریدار بن کر دکان پر جا پہنچا ہو جس کے سامنے پیتل اور سلور کے مینار پڑے ہوں۔ عموماً کسی غیر معروف مقام کو تلاش کرنے کے لیے کسی مشہور چوک یا بازار کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ لاہور جیسے شہر میں چوک جیسی جگہوں کا علم کم ہی کو ہوتا ہے لہذا ایسی جگہوں پر پہنچنے کے لیے کسی مشہور جگہ یا نمایاں مقام کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس بات کو اقتباس کی پہلی سطر میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرح سے یہ لاہور کی معاشرت کا نمایاں پہلو ہے جس میں مختلف مقامات اپنے حدود اربع میں معلومات کا خزانہ رکھتے ہیں۔

ٹکسالی دروازہ:

لاہور شہر کے اندر موجود ٹکسالی دروازہ مغل بادشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں تعمیر کیا گیا۔ یہ دروازہ لاہور شہر کی شاہراہوں پر تعمیر شدہ دروازوں میں سے ایک ہے۔لاہور کی مشہور بادشاہی مسجد بھی اسی دروازے کے قریب ہے۔ ٹکسالی دروازہ لاہور شہر کی غربی جانب واقع ہے۔شاہان سلف کے دور میں اس دروازے کے اندر ایک دارالغرب عالیشان صورت میں موجود تھا۔اس جگہ سکے سلوک و معروب ہوتے تھے اور اسی مناسبت سے اس کا نام ٹکسالی دروازہ مشہور ہو گیا۔جب کہ اصل دروازے کے آثار اب غائب ہو چکے ہیں۔

اس مشہور اور تاریخی دروازے کا نام شاہ جہان کے دور(۱۶۲۸۔۱۶۵۸)میں ٹکسالی دروازے کے نام سے عوام میں مقبول ہوا۔اس نام کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس وقت کرنسی کی تاریخی صورت سکوں کی شکل میں تھی۔اس وقت سکے ہی کرنسی کا کام دیتے تھے اور اسی وجہ سے ان سکوں پر مطلوبہ عبارت کنندہ کرنے کی غرض سے ایک ٹکسال بنایا گیا۔ ٹکسالی دروازہ کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے ماسٹر امر ناتھ لکھتے ہیں:

> "ٹکسالی دروازہ اپنی وجہ تسمیہ خود بتلا رہا ہے۔کیونکہ مغلوں کے عہد میں یہاں شاہی ٹکسال ہوتی تھی۔ٹکسال کے ساتھ منسوب ہونے کی وجہ سے ٹکسالی دروازہ کہلایا"(۴)

جس دور میں ٹکسالی دروازہ بنایا گیا اس دور کو گزرے تقریباً گیارہ سو پچاس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔البتہ پاکستان بلکہ دنیا بھر کے لوگ اس دروازے کو ٹکسالی دروازے کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ سکھوں کے عہد حکومت سے یہ تاریخی ٹکسال ایک کھنڈر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا بعد میں جب انگریزی حکومت کا دور آیا تو یہ رہی سہی ساکھ بھی کھو چکا تھا۔اس دروازے کے تاریخی نام کے حوالے سے کنہیالال کپور اپنی کتاب "تاریخ لاہور" میں یوں رقمطراز ہیں:

> "شاہان سلف کے عہد میں اس دروازے کے اندرون شمالی میدان میں دارالغرب شاہی میں ایک عالی شان مکان تیار ہوا تھا اور اسی جگہ ہر ایک کا سکہ سلوک و مغروب ہوتا تھا۔اس ٹکسال کے سبب سے اس کا نام ٹکسالی دروازہ مشہور ہوا"(۵)

ایک بات یہاں واضح ہے کہ یہ نام کٹاس سے اخذ کیا گیا ہے جو کہ کسی دور میں پنجاب کے حکمران رہ چکے ہیں۔راولپنڈی گزٹیئر ۱۸۹۳ء میں کٹاس کے متعلق یہ بات موجود ہے کہ یہ راولپنڈی کے باشندے تھے۔ ٹکسالی کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے یہاں اور بے شمار چیزیں موجود ہیں۔اس جگہ داخل ہوتے ہی ساتھ ٹکسالی مسجد توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔یہ دروازہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے مذہبی ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے۔یہاں پر مندر، مسجد اور گردوارہ ساتھ ساتھ ہیں۔ ٹکسالی دروازے کے نام کے حوالے سے یاسر جواد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

> "ٹکسالی اور مستی دروازوں کے نام قریب واقع تاریخی جگہوں سے منسوب ہیں البتہ ٹکسالی کا نام زمانے میں کافی پیچھے تک جاتا ہے۔۔۔ٹکسالی کا نام کوئی ایک سو سال پہلے دروازے کے قریب قائم شاہی ٹکسال کی وجہ سے پڑا۔تاہم یہ نام اس سے بھی پہلے، ٹکوں، سے منسوب تھا"(۶)

اس کے علاوہ بھی ٹکسالی میں بے شمار تاریخی اور ثقافتی مقامات اپنی شناخت کے لحاظ سے عمدہ نمونے ہیں۔جن میں حکیم فضل الٰہی کا مشہور دواخانہ "چشمہ حیات" موجود ہے اور اسی طرح پنجابی زبان کے مشہور شاعر شاہ حسین کے استاد دامن بھی یہاں رہ چکے ہیں۔موجودہ وقت میں آج بھی دامن اکیڈمی موجود ہے۔ ٹکسالی دروازے کی اہمیت اور مصروف ترین جگہ ہونے کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

> "پہلا سکول اندرون شہر میں تھا،دوسرا ان بارہ دروازوں سے گھری دنیا سے باہر۔سکول پہنچنے کے لیے اسے جانی پہچانی گلیوں کے بجائے ٹکسالی گیٹ سے باہر پر ہنگامہ سڑکوں سے گزرنا پڑتااور اردو بازار سے ہو کر جانا پڑتا جو چھٹی کے وقت بے شمار گدھا گاڑیوں، بیل، گاڑیوں، ریڑھیوں، لوڈرویگنوں، رکشاؤں، سائیکلوں، موٹر سائیکلوں، راہگیر و ں،اور دکانوں کے باہر فٹ پاتھ پر پڑے کتابوں ،کاپیوں اور کاغذ کے گٹھڑوں سے اٹا ہوتا"(۷)

اس کے علاوہ بے شمار مقامات اپنی اہمیت کے حوالے سے ٹکسالی سے منسوب ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں اندورن لاہور ٹکسالی دروازہ وہ واحد جگہ ہے جہاں ثقافت، موسیقی، تاریخی نوادرات اور لاہوری کھانا تمام چیزیں ایک ہی جگہ موجود ہیں۔

لوہاری دروازہ:

لاہوری دروازہ لاہور شہر کے مشہور تیرہ دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جو آج بھی اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ اس دروازے کا اصل نام لوہاری دروازہ ہے جو کہ بعد میں غلط العام لاہوری دروازہ مشہور ہوا۔ لاہوری دروازہ قدیم لاہور کی فصیل کے جنوب میں واقع ہے۔ اس دروازے کے بائیں جانب موری دروازہ جبکہ دائیں جانب شاہ عالمی دروازہ واقع ہے۔ لاہوری دروازے کا نام لاہور شہر سے منسوب کیا گیا تھا۔ اس حوالے سے ماسٹر امر ناتھ لکھتے ہیں: "اس کا اصل نام لاہوری ہے۔ جو کہ شہر لاہور کے نام پر ہی رکھا گیا تھا"[۸] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لاہور کا علاقہ اچھرہ لاہور کی قدیم ترین بستی تھی جبکہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ قبرستان میانی صاحب سب سے قدیمی بستی تھی جو کہ لاہوری دروازے میں واقع تھی۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ دروازہ شہر کے اندر داخل ہونے کا پہلا راستہ تھا اس حوالے سے کنہیالال کپور اپنی کتاب "تاریخ لاہور" میں لکھتے ہیں:

> "جب سلطان محمود غزنوی کے چاچا راجہ جے پال نے انگیال کو لاہور سے بے دخل کر کے پنجاب کا علاقہ اپنے ماتحت کر لیا تو راجہ جے پال چند ماہ تک اسی علاقے میں محصور ہو کر لڑتا رہا آخر بھاگ گیا۔ محمود نے شہر کو آگ لگا دی اور رعایا کو قتل کر دیا جس سے شہر ویران و برباد ہو گیا۔ رعایا کے لوگ کچھ قتل ہوئے اور کچھ بھاگ گئے۔ چند سال شہر غیر آباد رہا آخر جب ملک ایاز پنجاب کے انتظام کے لئے مامور ہوئے تو اس نے شہر کو دوبارہ آباد کرنا چاہا۔ سب سے پہلے آبادی شہر کی اسی محلے سے شروع ہوئی جس کو لاہوری منڈی کہتے ہیں اور سب سے پہلے یہی دروازہ تعمیر ہوا جس کا نام لاہوری دروازہ رکھا گیا"[۹]

عہد برطانیہ میں لاہور شہر کے دروازوں کو دوبارہ بنایا گیا لیکن ان کو اصل شکل کے برعکس بنایا گیا۔ دل دلچسپ بات یہ ہے کہ لاہوری دروازہ اس توڑ پھوڑ سے محفوظ رہا اور اسے بالکل اسی صورت میں تعمیر کیا گیا۔ جب لاہوری دروازے سے اندر کی جانب جائیں تو ساتھ ہی لاہوری دروازہ شروع ہو جاتا ہے اور اسی جگہ موجود لاہوری منڈی لاہور شہر کی سب سے قدیم منڈی ہے۔ دروازے کے بائیں جانب جامع مسجد آمنہ مدرسہ شیر ربانی ہے۔ لاہوری دروازے میں موجود کمروں کے اندر صوبائی حکومت نے ایک سکول بنایا ہے۔ محمد عاصم بٹ اپنے ناول "دائرہ" میں لاہوری دروازے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "نورین کو اندرون لوہاری دروازہ میں ایک سکول میں چھٹی جماعت میں داخل کروا دیا گیا۔ جس کا نام ہمیشہ اسے بہت پسند رہا "لٹل برڈز" اس یکسر نئی اور مختلف زندگی کے تجربے نے اس بچی کو ایک مدت تک ہراساں کیے رکھا۔ شروع کے کئی برسوں تک وہ اس گنجان آباد شہر کو سمجھ ہی نہ سکی۔ اس کے تنگ اور پیچیدہ راستے اسے الجھاتے۔ لوگوں کے جمِ غفیر میں اسے گھبراہٹ ہوتی۔ بہت محدود آسمان، بلند عمارتیں اور گرد آلود شور۔ یہ جگہ کتنی مختلف تھی اس کے گاؤں کے لحاظ سے اور کیسے لوگ یہاں رہتے ہوں گے۔ بہت آہستہ آہستہ وہ ان سے مانوس ہوئی۔ کبھی وہ ٹریفک کے اژدحام سے لبالب بھری بہت چوڑی سڑکوں کو دیکھ کر ڈر جاتی۔ کوئی کار زناٹے سے قریب سے گزرتی تو سہم جاتی۔ اس کا ننھا سا دل دیر تک سوکھے پتے کی طرح لرزتا"(۱۰)

اقتباس مذکورہ بالا کو پڑھنے کے بعد لاہوری زندگی کے چند گوشے بڑے واضح طور پر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ اولذکر لاہوری دروازے سے ملحقہ عمارات جن کی بلندی اور وسعت، جدید طرز رہائش اور قدیم عمارتوں کے منظر کو تازہ کرتی ہے۔ ٹریفک کا ہجوم لاہور جیسے شہر کا معمولِ زندگی ہے جس کے متعلق آئے روز اخبارات اور ٹی وی اشتہارات بتاتے رہتے ہیں۔ مصنف نورین کے حوالے سے جب اس پیرے کا آغاز کرتے ہیں تو سکول کے نام کی پسندیدگی الفاظ کی معنوی خوبصورتی بڑھا دیتی ہے۔

اس کے بعد جس ماحول کو نورین کے لیے بنایا گیا ہے جسے دیکھ کر اس کا ننھا سا دل سوکھے پتے کی طرح لرزتا ہے در اصل دیہاتی اور شہری زندگی کا فرق بیان کرتا ہے۔ یہاں شہری زندگی در اصل لاہوری زندگی ہے جو کہ بہت زیادہ الجھی ہوئی زندگی کا محور ہے۔ جگہوں کا ذکر کر کے ان کی تنگی اور وسعت بیان کرنا سکول کا نام جغرافیائی ہئیت کے تناسب کو ملحوظ رکھ کر کرنا اور ٹریفک کے اژدہام سے مراد لاہور کی بے ہنگم ٹریفک کا ذکر کرنا اور اس ساری مجموعی فضا میں نورین کا ہکا بکا رہنا ایک ثقافتی اور تہذیبی خلا کو بیان کرتا ہے جو دیہاتوں اور لاہور جیسے بڑے شہر کے درمیان میں موجود ہے۔

ففتھ روڈ:

ہر بڑے شہر کے اندر پائے جانے والے چوراہے اور روڈ ہی اس کے کسی مقام تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ کوئی بھی علاقہ اپنے روڈ اور سڑکوں کی بدولت ہی لوگوں کو اپنی طرف مائل کر سکتا ہے۔ ففتھ روڑ لاہور شہر کا ایک چھوٹا سا روڈ ہے جو کہ عام طور پر مشہور بھی نہیں ہے لیکن مصنف نے اس روڈ کا ذکر کر کے اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے کہ کس طرح یہ روڈ لاہور شہر کی زینت ہے۔

اس روڈ کے ساتھ ساتھ ایک بہت پرانی بستی ہے جو کہ لاہوری ثقافت کی پرانی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس پرانی بستی کے اندر لوگوں کے بوسیدہ مکان اور کچی سڑکیں اور پانی کے جگہ جگہ گڑھے موجود ہیں۔ یہ مناظر اس بات سے باور کراتے ہیں کہ بظاہر اتنا خوبصورت نظر آنے والا شہر اصل میں کیا ہے۔ اس کا معیارِ زندگی کیا ہے اور اس شہر کی حقیقت کیا ہے۔ اس بات کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ لوگوں کا آپس میں معاشی اور معاشرتی سلسلہ کن اصولوں پر قائم ہے۔ اس علاقے کا رہائشی رکشے والا کس انداز میں اپنی مجبوریوں کا رونا روتا ہے مصنف نے ایک جگہ بڑی خوبصورت تصویر کشی کی ہے:

> "آصف مراد نے ففتھ روڈ پر ایک رکشے والے سے کرایہ طے کیا۔ اس نے اسی روپے مانگے جو اگرچہ اسے مناسب ہی لگے لیکن اس سے بھاؤ تاؤ کئے بغیر رکشے میں بیٹھنا اسے ٹھیک نہ لگا اور اسے ستر روپے کے لیے کہا۔ رکشے والے نے پٹرول کی مسلسل بڑھتی ہوئی

قیمتوں کا رونا رویا۔ کچھ دیر اسے سننے کے بعد اس نے سر ہلایا اور کہا کہ وہ پچھتر سے زیادہ ہر گز نہیں دے گا۔ رکشے والے نے ہاتھ کے اشارے سے سبز سگنل دیا اور وہ دروازے کو باہر کی طرف کھینچ کر اندر گھس گیا"(۱۱)

مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح سے لاہوری کلچر میں بھاؤ تاؤ کے حوالے سے لوگ گفتگو کرتے ہیں اور رکشے والے کس طرح تنخواہ دار طبقے کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ بیچارہ تنخواہدار آدمی بھی زیادہ بحث کرنے سے ڈرتا ہے کہ کہیں دوسروں کے سامنے اس کی پول نہ کھل جائے۔ وہ احتجاج کر کے بھی کیا کر سکتا ہے۔ اس کا فائدہ تو اسے ہونے والا نہیں۔ اس لیے وہ تھوڑی بہت بحث کر کے چپ ہو جاتا ہے اور رکشے والا اسے قائل کر کے اپنا کام سیدھا کر لیتا ہے۔ مصنف نے اس روڈ کی مناسبت سے لاہوری کلچر کی پرانی تصویر کو دکھانے کی کوشش کی ہے کہ پیرس جیسے شہر سے مشابہت رکھنے والے لاہور میں بھی لوگ کچی آبادیوں میں جانوروں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان لوگوں کے تاثرات کو مصنف نے قلم بند کیا ہے تاکہ قاری لاہور کی اصل صورت سے واقفیت حاصل کر سکے۔

حسین چوک:

ڈیوچے بینک روڈ پر بائیں جانب ایک میل کی دوری پر حسین چوک واقع ہے۔ یہ چوک اپنے کھانے پینے کے سامان جیسا کہ کباب، ٹکی، لسی، سموسہ، پکوڑا اور خاص طور پر تلے ہوئے نان کی وجہ سے بہت مشہور چوک ہے۔ اس چوک کے اطراف میں کافی سارے سرکاری و غیر سرکاری دفاتر موجود ہیں اور یہاں ہزاروں کی تعداد میں ملازمین دن بھر کھانا کھاتے ہیں۔ اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں: "وہ حسین چوک تک ہی گیا ہو گا۔ اپنے دل پسند چپلی کباب لینے"(۱۲)

یہاں پر چھوٹی چھوٹی کھانے پینے کی اشیاء کی بہت سی دکانیں موجود ہیں اور ساتھ ساتھ ریڑی والے بھی کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس چوک سے تھوڑا پرے سڑک کے دونوں اطراف میں جامن اور شیشم کے درختوں کی لمبی قطاریں موجود ہیں۔ یہ دورویہ سڑک کے وسط میں سبز پٹی تھی جس پر چوک اور ان جنگلوں کے درمیان میں

چھوٹے چھوٹے قد کے بہت سارے درخت لگے ہوئے تھے۔ یہ تمام بوٹے مدتوں ننھی شاخوں کے کے ساتھ سیدھے کھڑے اپنے بلند ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ درخت ہوا کی صفائی کی خاطر آہستہ آہستہ اپنی جان کی بھینٹ دیتے رہتے ہیں۔

لاہور شہر جو کبھی باغوں اور درختوں سے لدا پھدا شہر تھا اب صرف لمبی لمبی سڑکوں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اور ان سڑکوں کے ارد گرد صرف کالونیاں آباد ہیں۔ جب بھی کبھی گرمیوں کا موسم آتا ہے تو یہاں موجود جامن کے درخت پھل سے بھر جاتے ہیں اور جھڑ جھڑ کر فٹ پاتھ کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ راہ گیر انہیں پیروں تلے مسل کر چل دیتے ہیں اور سڑک سلیٹی رنگ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

منٹو پارک:

لاہور شہر میں منٹو پارک اپنی تاریخی اہمیت کے حوالے سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ قراردادِ پاکستان ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اسی پارک میں پیش کی گئی۔ پاکستان کے سفر میں منٹو پارک کو ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ مینارِ پاکستان کی تعمیر کے بعد منٹو پارک ایک سیاحتی مقام بن گیا۔ جب انگریز حکومت کے خلاف تحریکوں کا آغاز ہوا تو مختلف سیاسی پارٹیوں جن میں کانگریس اور مسلم لیگ بھی شامل تھیں اپنے جلسوں اور تقریبات کے لئے منٹو پارک اور اس کے ارد گرد کے پلاٹ استعمال کرتی تھیں۔

منٹو پارک کو مقبولیت اس وقت ملی جب مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس اس جگہ منعقد ہوا اور اس اجلاس کی صدارت قائد اعظم محمد علی جناح نے کی۔ ہند بھارت سے آئے حریت پسندوں کے ذہنوں میں جس عظیم ملک کا خواب انگڑائیاں لے رہا تھا اسے منٹو پارک میں منظور ہونے والی قرارداد پاکستان کی شکل میں نشانِ منزل نظر آیا۔ اس قرارداد کی منظوری کے سات سال بعد پاکستان معرض وجود میں آیا۔

برطانوی سامراج کے نمائندے گورنر لارڈ منٹو کے نام سے اس پارک کا نام موسوم رہا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس پارک کا نام اقبال پارک رکھا گیا۔ منٹو پارک جسے گریٹر اقبال پارک کے نام سے بھی جانا جاتا ہے آزادی

چوک میں شاہی قلعہ اور بادشاہی مسجد کے ساتھ واقع ہے۔ اس پارک کا مجموعی رقبہ پچیس ایکڑ ہے۔ اس پارک میں ایک جھیل بھی بنائی گئی ہے اور سیر کرنے والوں کے لیے ایک ٹرین بھی یہاں چلائی گئی ہے۔

اس پارک کے اندر ایک شاندار لائبریری بھی موجود ہے جس میں ادب کے پجاری اپنی پیاس بجھانے کے لیے بڑی تعداد میں آتے رہتے ہیں۔ قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری اور علامہ اقبال کا مزار بھی اسی اقبال پارک کے احاطے میں واقع ہے۔ اس پارک میں ایک کرکٹ گراؤنڈ بھی موجود ہے جہاں بچے کھیلنے آتے ہیں۔ اور گراونڈ کا ذکر مصنف نے اپنے ناول "دائرہ" میں بھی کیا ہے۔ مختلف مقامات کو جوڑ کر مصنف نے لاہور کے علاقے کی تہذیب و ثقافت کو بیان کیا ہے۔ عاصم بٹ لاہور شہر کے چپے چپے سے واقف ہے اور کسی ایک ایسی جگہ کا انتخاب کرتا ہے جس سے جڑی اور بہت ساری عمارتیں اور دیگر اشیاء قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہیں۔ اس حوالے سے رفاقت حیات اپنے مضمون "عاصم بٹ کا بھید" میں لکھتے ہیں:

> "عاصم بٹ شہر لاہور کی واڈ کو جانتا ہے اور وہ اسے جانتی ہے۔ اس لئے شہر لاہور کے گلی کوچے، بازار، باغات، عمارتیں اور دیگر جگہیں مختلف طریقوں اور مختلف شکلوں سے بار بار عاصم بٹ کے فکشن میں نمودار ہوتے ہیں اور اپنی دلنشین چھب دکھاتے ہیں۔ ناول بھید میں دکھائی دینے والے شہر لاہور کی چھب اتنی گہری اور متاثر کن ہے کہ اس کی چکاچوند سے تادیر باہر نکلنا ممکن نہیں رہتا"(۱۳)

منٹو پارک ایک زمانے میں پہلوانی کے اکھاڑے کے لیے بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ یہ پارک لاہوری کلچر کی ایک عظیم یادگار بھی ہے۔ اس پارک میں پہلوانی کے بڑے بڑے نام پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ اے حمید منٹو پارک میں ہونے والے ایک مقابلے کو یوں قلم بند کرتے ہیں:

> "دیر کی بات ہے منٹو پارک میں یونس پہلوان اور کالا پہلوان کی کشتی ہوئی۔ دنگل ابھی شروع ہوا ہی تھا کہ پہلونوں کی ٹولیوں میں کسی بات پر تو تو میں میں ہو گئی اور ایک دوسرا دنگل شروع ہو گیا۔ پولیس بیچاری کو ایک ناگہانی بلا کی مطلق توقع نہ تھی۔ اس نے بہیترا امن کرانے کی کوشش کیلیکن دس دس روپے کا ٹکٹ خرید کر آنے والوں نے ہلڑ مچا دیا۔ باہر

سے لوگ دو روپے والی پہلی کلاس میں گھس آئے۔ درجہ اول کرسیوں پر کھڑا ہو گیا۔ درجہ دوم نے درجہ اول کے کندھوں پر چڑھنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درجہ اول کرسیاں توڑنے لگا"(۱۴)

عاصم بٹ نے منٹو پارک کے منظر پیش کر کے لاہوری معاشرے کے اس رخ کی نشاندہی کی ہے کہ لوگوں کا پارک کی طرف رخ کرنا کسی بھی معاشرے میں بڑا اہم پہلو ہوتا ہے اور اس حوالے سے لاہور شہر کے رہنے والے کیا کیا انداز اپناتے ہیں۔ بچے کھیل کود کے لیے پارک کو سب سے محفوظ جگہ سمجھتے ہیں اور بچے بوڑھے شام کے وقت پارک رخ کر کے اپنے زندہ دل ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس منظر کی تصویر کشی مصنف نے یوں کی ہے:

"اتوار کے اتوار گلی کے لڑکے اکٹھے ہو کر منٹو پارک کرکٹ کھیلنے جاتے۔ بس تبھی وہ سید مٹھا بازار سے گزرتا۔ مٹھو کباڑیے کی دکان تب بند ہوتی۔ لیکن اس دکان میں اسے اب دلچسپی کہاں رہی تھی۔ اتوار کے اتوار منٹو پارک میں کرکٹ کھیل کر لوٹتے تو خوب دن چڑھ آتا۔ لڑکے ٹولیوں میں بٹ جاتے"(۱۵)

لاہور شہر کے اندر تنگ و تاریک گلیاں ہونے کے باعث زیادہ تر بچے اپنی پسندیدہ سرگرمیوں خاص کر کھیل کود کی غرض سے اکثر پارکوں کا رخ کرتے دکھائی دیتے ہیں

رشید ٹی سٹال:

جیسے کسی بڑے علاقے کی پہچان وہاں پر موجود مشہور جگہوں، پارکوں اور ہوٹلوں وغیرہ سے ہوتی ہے ویسے ہی لاہور کی پہچان یہاں پر موجود ڈھابوں، پان شاپس اور ٹی سٹال وغیرہ سے ہوتی ہے۔ رشید ٹی سٹال سلائم اسٹوڈیوز سے کوئی فرلانگ بھر دور دوسرے بازار سے ملحق ایک چوک میں گلی کی نکڑ پر واقع تھا۔ جب شام کا وقت ہوتا تو یہ ٹی سٹال لوگوں کے ہجوم سے بھر جاتا۔ بہت سارے بے روزگار، نوکریوں سے واپسی سے پر ہوتے ہوئے کلرک اور سیاسی و معاشی مباحثوں کے شوقین دانشوروں کا سیلاب یہاں پر روزانہ کی بنیاد پر امڈ آتا۔ ایسے بے شمار

ہوٹل اور مشہور جگہیں شہر بھر میں موجود ہیں جو لاہوری کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں اس حوالے سے اے حمید لکھتے ہیں:

> "لاہور کی نفسیات ہوٹلوں میں چھپی ہوئی ہے۔اس شہر کا ہر ہوٹل اپنی جگہ ایک انسٹی ٹیوشن ہے۔ایک مکمل سکول آف تھاٹ ہے۔ان ہوٹلوں میں ٹی ہاؤس ہے ۔کافی ہاؤس ہے۔۔۔۔جو نئی تہذیب کے علمبردار ہیں اور دم توڑتی تہذیب کو سہارا دیے ہوئے ہیں"(۱۶)

روایتی ہوٹلوں کی طرح دن کے وقت اس ٹی سٹال پر بھی دکان کے تھڑے پر چولہوں کو دھر دیا جاتا اور ان میں آگ جلا کر ان پر دودھ گرم ہونے کی غرض سے رکھ دیا جاتا تھا۔ان میں سے ایک چولے پر ایک بڑی سی کیتلی میں ہر وقت پتی ابلتی رہتی تھی اور ساتھ ہی نل کے نیچے پرچوں اور کپوں کا ڈھیر کھرے پر دھرا رہتا۔روزانہ شام کے وقت اس دکان میں اتنا رش ہو جاتا کہ اس میں کھڑے ہونے کو ذرا بھی جگہ نہیں ملتی۔لوگ کرسیاں اٹھا کر دور دور جا کر بیٹھتے۔لوگوں کا یہ حال تھا کہ ایک دوسرے کی بات سننے کی بجائے ٹولیوں کی صورت میں بیٹھ کر یہاں باتیں کرتے جن میں زیادہ تر بے روزگار ہوتے اور نوکری نہ ملنے کی صرف ایک ہی وجہ جانتے تھے کہ یہاں سفارش سے کام ہوتا ہے۔دوسرے امیدواروں سے ہر لحاظ سے بہتر ہونے کے باوجود بھی ان کی درخواست رد کر دی جاتی ہے کیونکہ ان کے پاس کسی کی بڑی سفارش موجود نہیں ہوتی۔اس حوالے سے مصنف یوں لکھتے ہیں:

> "سپہ پہر کے قریب آصف رشید ٹی سٹال پر جا کر بیٹھ جاتا جو ان کے گھر سے کوئی فرلانگ بھر دور بازار کے قریب گلی کی نکڑ پر واقع تھا۔شام ہوتے ہوتے یہ اس جیسے بے روزگاروں ،نوکریوں سے واپس لوٹتے ہوئے کلرکوں ،سیاسی مباحثوں کے شوقین عوامی دانشوروں کی آماج گاہ بن جاتا"(۱۷)

یہ تمام لوگ سیاستدانوں ،مذہبی لوگوں، سماجی رہنماؤں ،دانشوروں ،ادیبوں اور صحافیوں کو لتاڑتے اور جب اس سے بھی دل کی تشفی نہ ہوتی تو ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر لڑتے۔دراصل مصنف نے اس ٹی سٹال پر آنے والے لوگوں کے توسط سے اس معاشرے کی تصویر پیش کی ہے جو پڑھے لکھے تو ہیں لیکن بے روزگاری کے

ہاتھوں مجبور ہو کر مایوسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ رشید ٹی سٹال لاہور کی تہذیب و ثقافت کا حصہ ہے جہاں پر لوگ آکر ایک دوسرے کے حال احوال کو جانتے ہیں اور اپنا وقت پاس کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔

سبلائم سٹوڈیوز:

عاصم بٹ کا ناول "دائرہ' چونکہ ایک فلمی دنیا کی کہانی کے گرد گھومتا ہے اس لیے فلمی دنیا میں اسٹوڈیوز کا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ اس ناول میں انہوں نے اسوڈیوز کے ذریعے اسٹوڈیو کلچر کی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ یہ اسٹوڈیو اقبال ٹاؤن کے قریب ایک چھوٹے سے روڈ پر واقع تھا۔ اس اسٹوڈیو میں بہت بڑی بڑی فلموں کی بھی شوٹنگ ہوتی رہی ہے۔

در اصل اس سٹوڈیو کے ذریعے مصنف نے وہاں پر موجود لوگوں کے ذہنی تناؤ اور باہر سے بہت خوبصورت نظر آنے والے ایکٹرز کے حالات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں پر فلمی دنیا سے وابستہ لوگ کس طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی کیا کیا مجبوریاں ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ مصنف نے اس ناول میں بیان کیا ہے۔ لاہور شہر فلمی دنیا میں بڑا نمایاں نام رہا ہے اور کسی وقت میں تو یہاں پر ایک ہی وقت میں بیسیوں فلموں پر کام جاری رہتا تھا۔ اسی کلچر کو مصنف نے یہاں بیان کیا ہے کہ یہ ایکٹرز اپنی زندگی میں کن حالات سے گزر کر یہاں تک آتے ہیں اور لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرتے ہیں۔

اس ناول کے مرکزی کردار راشد کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ اسی سبلائیم سٹوڈیو سے جڑا ہوا ہے۔ اس نے اپنی ساری فلمیں اسی اسٹوڈیو میں شوٹ کی ہیں۔ یہ سٹوڈیو لاہور کلچر کی ایک خاص پہچان ہے۔ لاہور شہر کے اندر آپ کو ایسے بے شمار اسٹوڈیو مل جاتے ہیں۔ ان سٹوڈیوز میں ہزاروں لوگ روزانہ کی بنیاد پر ایک فلمی دنیا میں آتے ہیں اور مختلف قسم کے کردار نبھاتے چلے جاتے ہیں۔ لاہور شہر کا فلمی دنیا میں ایک بہت بڑا نام رہا ہے۔ سبلائم سٹوڈیو کی اہمیت اور منظر کشی کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

> "سٹوڈیو سے باہر نکلتے ہوئے وہ پھاٹک کی پیشانی پر لگے بڑے بورڈ پر "سبلائم سٹوڈیو
> "کا نام پڑھ چکا تھا۔ یہ نام اس کے لیے اجنبی تھا۔ کبھی سٹوڈیوز یا فلموں میں دلچسپی لی ہو تو

ایسے نام ذہن میں رہیں۔ یاد نہیں آتا تھا کہ آخری بار اس نے کب سینیما جا کر فلم دیکھی تھی"(۱۸)

آج بھی لاہور کے اندر کئی اچھے اسٹوڈیوز موجود ہیں جو اچھی فلمیں بناتے ہیں لیکن ان کا زیادہ تر کام اب ڈرامہ کلچر کی طرف چلا گیا ہے۔ پاکستانی فلموں کی مانگ میں بہت حد تک کمی واقع ہو چکی ہے۔ اس حوالے سے سوم آنند لکھتے ہیں:

"انڈسٹری کو ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ کسی سے مقابلہ نہ رہا جس کے سبب اچھی فلمیں نہ بن سکیں۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ پاکستانی فلم ساز باہر کے ملکوں سے ہندوستانی فلمیں دیکھ کر آتے اور پھر ان کے چربے اتارتے۔ یہ بیماری اس قدر پھیلی کہ کچھ برس پہلے تک لاہور میں جب بھی کوئی نئی فلم ریلیز ہوتی تو لوگ پہلے یہ ہی پوچھتے کہ یہ کس ہندوستانی فلم کا چربہ ہے"(۱۹)

اس لئے اس کا ذکر کے مصنف نے قاری کو ایک ایسی دنیا کی سیر کرائی ہے جو اس نے صرف فلمی دنیا میں دیکھی ہے لیکن وہ حقیقت سے کتنی دور ہے یہ اس ناول کو پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے۔

اقبال ٹاؤن:

یہ علاقہ لاہور شہر کا ایک ویل ڈیولپڈ علاقہ مانا جاتا ہے۔ جب ٹھوکر نیاز بیگ سے لاہور شہر کے اندر داخل ہوں تو ساتھ ہی بائیں طرف مولانا شفقت علی روڈ آتا ہے۔ اس روڈ پر جائیں تو سامنے فیصل ٹاون اور جوہر ٹاون وغیرہ کے علاقے آتے ہیں۔ جب جوہر ٹاون سے گزرتے ہیں تو سامنے بائیں طرف اقبال ٹاؤن کا علاقہ ہے۔

یہ علاقہ ایک بہت بڑا گارمنٹس کا مرکز مانا جاتا ہے۔ کسی بھی شہر، ملک یا قوم کی ثقافت میں اس کے لباس کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے اور لاہور میں ملبوسات کے حوالے سے بڑے مشہور علاقے ہیں جن میں اقبال ٹاؤن بھی ایک بڑی مارکیٹ کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ یہ علاقہ کریم بلاک اقبال ٹاؤن کے نام سے کافی مشہور ہے۔ ایسا

نہیں کہ صرف یہاں گارمنٹس کا کام ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت ساری دکانیں اور مارکیٹیں یہاں ہیں۔ لیکن گارمنٹس کے حوالے سے یہ ایک بہت بڑا علاقہ ہے۔

مصنف نے لاہور شہر کی ثقافت کے ایک بہت اہم پہلو کو اقبال ٹاؤن کی کریم بلاک مارکیٹ کے سہارے سے دکھایا ہے۔ یہاں پر لوگوں کا رہن سہن بالکل ایک ترقی یافتہ ملک کے کسی شہر کی صورت پیش کرتا ہے۔ یہاں کے لوگ رات ایک بجے کے بعد سونے کے معمول پر قائم ہیں اور صبح گیارہ بجے اٹھ کر اپنے معمولات زندگی کی طرف دوبارہ لوٹتے ہیں۔ اسی طرح اقبال ٹاؤن کی بڑی مارکیٹ بھی گیارہ بجے کے بعد عوام کے لئے کھلتی ہے۔ یہاں پر کھانے پینے کے بہت سارے ہوٹل اور ریسٹورینٹ موجود ہیں۔ یہاں کے شہری رات کے کسی بھی پہر جا کر یہاں سے کھانا کھا سکتے ہیں۔ اس حوالے سے مصنف ایک جگہ بیان کرتے ہیں:

> "تمہیں بھوک لگی ہے کیا؟ وہ پرے چوک میں روشنیوں میں نہائے ہوئے ریستوران کو دیکھ رہی تھی جس کے باہر مختصر سبزہ زار میں کرسیوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ ایک طرف باربی کیو پر تکے بھونے جا رہے تھے۔ اس نے کار ہوٹل کے قریب سڑک کے ایک طرف روک لی، کچھ کھانے کو لے لیتے ہیں۔ دو سینڈوچ پیک کروا لیتے ہیں"(۲۰)

لاہوری ثقافت میں گھر پر کھانا پکانے کا رواج اب کم ہوتا جا رہا ہے۔ جب لاہور کا رخ کریں تو آپ کو ہزاروں کی تعداد میں لوگ ریسٹورنٹوں پر کھانا کھاتے دکھائی دیں گے۔ اسی بدلتے لاہور کے حقیقی روپ کو عاصم بٹ نے اپنے ناول "دائرہ" میں بیان کیا ہے۔

لارنس باغ:

لارنس باغ لاہور شہر کا ایک تاریخی باغ ہے۔ اس باغ کا موجودہ نام جناح باغ ہے جو کہ پہلے لارنس باغ کہلاتا تھا۔ اس کا پہلا نام جان لارنس کے نام سے منسوب تھا جو ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۹ء تک یہاں وائسرائے کہ منصب پر فائض رہا۔ لارنس گارڈن مال روڈ کے دائیں جانب انارکلی بازار لارنس اور منٹگمری ہال کے درمیان میں واقع ہے۔ لارنس باغ ۱۱۲ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ ۱۸۶۰ء میں جب اس باغ کے لیے یہ جگہ خریدی گئی اس وقت یہ علاقہ

بالکل سنسان تھا۔ ۱۸۶۰ء میں ہی اس باغ میں درخت لگانے کا کام شروع کیا گیا اور ۱۸۶۸ء میں اس جگہ میں توسیع کی گئی اور اس کا رقبہ ۱۱۲ ایکڑ سے بڑھا کر ۱۴۱ ایکڑ کر دیا گیا۔ مزید رقبہ خریدنے کے لئے بادامی باغ کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم ادا کی گئی۔

اس باغ کے ایک حصے پر انگریزی کلچرل سوسائٹی آف پنجاب قابض ہے۔ اسی مقبوضہ جگہ پر ایک نباتاتی باغ قائم ہے۔ بقیہ جگہ عوام کی سیر و تفریح کے لیے مختص کی گئی ہے۔ اس کے ایک حصے میں سبزہ زار، قائداعظم لائبریری، تھیٹر، ٹینس کا میدان، کرکٹ کا میدان اور ایک ریستوران کی سہولت اسی جگہ صبح اور شام موجود ہے۔

اس باغ کا شمار پاکستان کے خوبصورت اور اہم ترین باغات میں کیا جاتا ہے۔ لارنس باغ میں ۱۴۰ اقسام کی جھاڑیاں، ۱۵۰ اقسام کے مختلف درخت، ۱۳۰ اقسام کی ایک سمتی درخت ۱۵۰ اقسام کی بیلیں اور ۱۰۰ سے زائد پودوں کی اقسام بھی موجود ہیں۔ اگر پھولوں کی تعداد کے حوالے سے بات کریں تو ۱۲ سے زائد اقسام کے مختلف موسموں کے پھول سالانہ بنیاد پر کاشت کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ادبی حوالے سے بات کریں تو قائداعظم لائبریری کے علاوہ مزید دو کتب خانے بنائے گئے ہیں۔ جو دار السلام اور جناح لائبریری کے نام سے موسوم ہیں۔

لارنس گارڈن کے اندر منٹگمری ہال اور پرنس ہال تعمیر کیے گئے ہیں۔ پرنس ہال سر جان لارنس کی یاد میں ۱۸۶۲ء میں بنایا گیا۔ اس کا ڈیزائن مسٹر جی سٹون نے تیار کیا اور اس کی تعمیر پر خرچ ہونے والا سرمایہ یورپی باشندوں کے عطیات سے جمع کیا گیا۔ اسی طرح منٹگمری ہال رابرٹ منٹگمری کی یاد میں تعمیر کیا گیا۔ ۱۸۶۶ء میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور اس کی تعمیر کے اخراجات مقامی عمائدین نے برداشت کیے۔ ان مقامی عمائدین کے ناموں کو ہال میں موجود ایک کتبے پر درج کیا گیا ہے۔ اس عمارت کی شان و شوکت کا اندازہ لگانے کے لئے ایک منظر دیکھنا کافی ہے۔ اس عمارت کا ڈیزائن این ایل جی ہنی گورڈان نے تیار کیا تھا۔ ان دونوں عمارتوں کی دیکھ بھال کے فرائض لاہور میونسپلٹی ادا کرتی ہے۔

بعد میں لارنس گارڈن کا نام تبدیل کر کے باغِ جناح رکھا گیا اس نام کی تبدیلی کی ضرورت کیوں پیش آئی حالانکہ سر جان لارنس جن کے نام سے یہ باغ منسوب تھا پنجاب کی زمین اور مجموعی طور پر ہندوستان کی مٹی کے لیے

ان کی خدمات گراں قدر ہیں۔ بانو قدسیہ نے اپنے ناول راجہ گدھ میں اس تبدیلی کی ایک وجہ بیان کی ہے وہ لکھتی ہیں:

> "پتہ نہیں لارنس باغ کا نام بدل کر کیوں جناح باغ کر دیا گیا۔ کچھ شہر والوں کی صلاح سے ملکہ وکٹوریہ کا بت رکھوایا جا چکا ہے یار دوستوں نے سڑکوں کے اسلامی نام رکھ دیئے ہیں، پرانے شہروں کو نئے ناموں سے نواز دیا تا کہ پچھلی تاریخ کا نشان نہ رہے، نئی نسلیں پرانے مظالم کے نشانات نہ دیکھ سکیں۔ پھر ان کے دل میں وہ نفرت نہ جاگ سکے جو ایسے سیمبل دیکھ کر عموماً جوان نسل لوگوں میں جاگتی ہے۔ اس طرح بچے اپنی تاریخ سے بھی کٹے رہیں اور روایات کا حصہ بھی نہ بن سکیں"(۲۰)

جس طرح تفریح گاہیں، پرانی عمارات، آثارِ قدیمہ، مساجد اور عبادت گاہیں اپنے معاشرے کی تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار ہوتے ہیں اسی طرح سے باغات اور تفریحی مقامات بھی معاشرے کی جلی کیفیات اور ذہنی طور پر خوشحالی کے عکاس ہوتے ہیں۔ انسانوں کا مجموعی رویہ کسی بھی قوم کے معاشرے کی تمام صورتحال کا پتہ دیتا ہے۔

عاصم بٹ نے اپنے ناول میں ایسے تاریخی اور ثقافتی مقامات کا انتخاب کر کے لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوشش کی ہے کہ جو قومیں اپنے آباؤ اجداد کی تہذیب و ثقافت کو نہیں بھولتیں وہی زندہ قومیں کہلاتی ہیں۔ لارنس باغ کا ذکر کر کے عاصم بٹ نے پنجاب خاص کر شہر لاہور کی زندگی اور ثقافت کو ہمارے سامنے پینٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ پارک کے اندر سنگِ مرمر کے پتھر کی کشش اور باغ میں لوگوں کا ہجوم، بچوں کا شور، پھول اور پودوں کی خوبصورت کیاریوں میں سجاوٹ جو کہ جوک در جوک لوگوں کو پارک کی طرف آنا اور فیملیوں کا اپنے بچوں کو گھمانے کے لئے پارک کا انتخاب کرنا لاہور شہر کی زندہ دلی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ جب مغربی ممالک کی بات کی جائے تو وہاں پر سال بھر کے چند مخصوص دنوں کی مناسبت سے لوگ آتے ہیں۔ پاکستان میں لوگ ہر نئی صبح کے ساتھ پارکوں کا رخ کرتے ہیں اور ذہنی سکون حاصل کرتے ہیں۔ مشرق اور مغرب کے اندر باغوں کی اہمیت کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں: "پاسکل کہنے لگی، مشرق میں باغ کا تخیل بھی ہمارے یہاں کس قدر مختلف ہے!"(۲۲)

عاصم بٹ نے اپنے ناول "دائرہ" میں نورین کی ذہنی کیفیات کو سمونے کے لئے لارنس باغ کا ایک خوبصورت رخ پیش کیا ہے جو کہ ہر فرد کی زندگی میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ نورین جب گاؤں سے شہر آتی ہے تو سکول میں پڑھنا شروع کر دیتی ہے اور سکول سے فارغ ہو کر وہ اپنے گھر میں رہتی ہے جو کہ گاؤں کے ماحول سے بالکل مختلف ماحول ہے۔

اپنے گاؤں میں وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول رہتی ہے اور اپنی ماں کے بنائے ہوئے عمدہ اور لذیذ کھانوں کا لطف اٹھاتی ہے۔ وہ اچانک شہر آ کر اداس ہونے لگ جاتی ہے اور بیزار رہنے لگتی ہے۔ اس کی دل جوئی کرنے کی غرض سے اس کی بہن اور بہنوئی اسے آئسکریم کھلانے اور اگر کبھی موسم اچھا ہو تو اسے لارنس باغ بھی لے جاتے اور وہ وہاں جا کر بہت خوش ہوتی اور اس کا دل زندگی سے بھرپور اور لوگوں کے جم غفیر میں لگنے لگ جاتا۔ عاصم بٹ نورین کی زندگی سے دل چسپی کو اپنے ناول میں یوں بیان کرتے ہیں:

> "ان سب محرومیوں کے باوجود شہر میں اس کا دل لگ گیا۔ اس کی بہن اور بہنوئی کبھی اسے سینما لے جاتے کبھی آئسکریم کھلانے بیڈن روڈ اور کبھی یوں ہی موسم اچھا ہو تو سیر کرنے کے لیے لارنس گارڈن۔ اب واپس گاؤں جانے کا خیال اس کے دل میں بوکھلاہٹ پیدا نہیں کرتا تھا۔ بہن سے یہ ضد تو کرتی کہ وہ ماں کو بلا لے مگر جب اس سے پوچھا جاتا کہ ماں سے ملنے جانا چاہتی ہے تو وہ کوئی فیصلہ نہ کر پاتی"(۲۲)

عاصم بٹ نے نورین کے کردار کا سہارا لے کر شہر لاہور کی اس زندگی کی جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے جو کہ ہر شہر اور ملک کی تاریخی مقامات اور تفریح گاہوں سے جڑی نظر آتی ہے۔ جس طرح بانو قدسیہ نے اپنے ناول "راجہ گدھ" میں کہا ہے کہ پڑھے لکھے لوگ اپنی تاریخی عمارات اور ان سے جڑی حقیقت سے آشنائی حاصل کر کے اپنی روایت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسی طرح عاصم بٹ نے اپنے ناول میں یہ معرکہ بڑی چابکدستی سے سر کیا ہے۔ اپنے ناول میں عاصم بٹ نے پاکستانی معاشرے کا وہ رخ بڑے دلیرانہ انداز میں بیان کیا ہے جو کہ عام لکھاری ہمارے سامنے بڑے مہذب

معاشرے کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ جوان سال لوگوں کی ملاقاتیں، عشق و معاشقہ کی داستانیں۔ ان پارکوں کا سہارا لے کر کس طرح وہ جنسی بے راہ روی کا شکار ہوتے ہیں اور نوید جیسے کردار کس طرح بھولی بھالی اور جوان لڑکیوں کا جنسی شکار کرتے ہیں۔ ان پارکوں میں ایسی بہت سی جگہیں ہوتی ہیں جہاں ڈیٹ ماری جا سکتی ہے۔ بوس و کنار اور آپسی تعلقات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ لاہوری کلچر میں عیاشی اور جنسی بے راہ روی کی مثال عاصم بٹ نے اپنے ناول "دائرہ" میں بڑی خوبصورتی سے بیان کی ہے۔ کس طرح لڑکے شکار کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں اس حوالے سے عاصم بٹ یوں لکھتے ہیں:

> "خود لارنس باغ میں وہ ایسی ایک سے زائد جگہوں کو جانتا تھا جو اونچی جھاڑیوں اور گھنے درختوں کی وجہ سے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتی تھیں۔ ڈیٹ مارنے والے جوڑے ان جگہوں کے گرد منڈلاتے دکھائی دیتے اور جوں ہی موقع ملتا ان میں کوطہ مار دیتے"(۲۴)

عاصم بٹ نے ان پارکوں میں پوشیدہ جگہوں کے علاوہ بھی کئی ایسے مقامات کا ذکر اپنے ناول میں کیا ہے جو ان جوڑوں کے کام آتے ہیں۔ ایسے ریستوران بھی موجود ہیں جو ان جیسے جوڑوں کو عیاشی کی سہولیات فراہم کرتے ہیں اور بل میں کچھ زائد رقم وصول کر لیتے ہیں۔ اس ناول میں عاصم بٹ نے لاہور شہر کے پارکوں کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے اور ساتھ ساتھ ایسے بہت سے واقعات جو کہ روزمرہ کی صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس باغ کو لاہور شہر کی دوباری آب سے سیراب کیا جاتا ہے۔ اس باغ کے باقی ماندہ اخراجات کے لیے صوبائی حکومت کے ساتھ ساتھ میونسپلٹی لاہور بھی کوشاں ہے۔

رنگا محلہ:

یہ علاقہ چھٹ پور کی ایک چھوٹی سی بستی کے طور پر جانا جاتا ہے۔ پہلے یہ صرف چھٹ پور کے نام سے جانا جاتا تھا لیکن پچھلے کچھ عرصے سے یہاں اور لوگ آباد ہونے کی وجہ سے اسے الگ الگ چھوٹی چھوٹی بستیوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جن میں ایک رنگا محلہ بھی ہے۔

یہ ایک بہت ہی پسماندہ قسم کی بستی ہے جو لاہور شہر کے جدید اور پوش علاقے کے پہلو میں کسی مفلوق الحال اور یتیم بچے کی طرح سہمی کھڑی ہے۔ یہ علاقہ ایک بہت بڑے گندے نالے پر آباد ہے۔ جو لاہور شہر کے مضافات میں ایسی بستیاں دیکھ چکے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی انتہائی پیچ دار اور تنگ و تاریک گلیاں ایک دوسری میں گھستے ہوئے بعض جگہوں پر تو بالکل غائب ہو جاتی ہیں۔ ان جگہوں میں سے گزرتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپ کسی اجنبی کے گھر کے صحن اور دالانوں میں سے ہوتے ہوئے خلوت خانوں میں سے گزرتے ہیں۔ اس بستی کی منظر کشی مصنف نے یوں کی ہے:

> "شہر کے مضافات میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے چھٹ پور۔ اس کی ایک بستی رنگا محلہ میں سائیں جبرو کا گھر تھا جس میں اس کی ہر وقت کھانستی ہوئی بیمار بیوی اور مسلسل بھوکا رہنے والا بچہ مفلسی کی چادر اوڑھے رہتے۔"(۲۵)

یہاں پر رہنے والے لوگوں کے مکان عموماً کچے ہیں اور گندے پانی میں ڈوبی گلیاں ایک دوسری میں خلط ملط معلوم ہوتی ہیں۔ مکانوں کی چنائی اینٹوں اور گارے سے کی جاتی ہے جبکہ ان مکانوں کی چھتوں پر شہتیر وغیرہ ڈال کر پکی مٹی سے لپائی کر دی جاتی ہے۔ اگر کسی کے پاس چار پیسے زیادہ ہوں تو وہ ٹی آر کا بندوبست کر لیتا ہے ورنہ ٹین کی چادر سے کام چلا لیا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کے روزگار کا سلسلہ بھی خدا ترسی پر ہی چلتا ہے۔ کبھی کسی کو کوئی کام مل گیا تو ٹھیک ورنہ کسی سے بھی مانگ کر لے آئے۔ دراصل یہ اس معاشرے کی تصویر ہے جو ایک عالیشان اور ترقی یافتہ لاہور کے بالکل مضافات میں بسا ہوا علاقہ ہے۔ ایسے علاقوں میں رہنے والے لوگ بیک وقت کئی مسائل کا شکار ہوتے ہیں لیکن ان کی دادرسی کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

ہیرا منڈی:

یہ بازار جنوبی ایشیا کے روایتی ریڈ لائٹ علاقوں کے تمام پہلو رکھتا ہے۔ ہیرا منڈی ٹکسالی گیٹ کے ساتھ تھی۔ پہلے یہ علاقہ شاہی محلہ کہلاتا تھا لیکن پھر ہیرا منڈی میں تبدیل ہو گیا۔ ایک دور میں اس بازار میں پھولوں کی دکانیں جابجا تھیں۔ مغل دور حکومت میں یہ علاقہ ہیرا سنگھ نے آباد کیا تھا لیکن تب یہ بازار جسم فرشی کے کام سے

پاک تھا۔ یہاں اس وقت صرف موسیقار اور رقاصائیں ہوا کرتی تھیں۔ ہیرا منڈی کی مجموعی صورت حال بیان کرتے ہوئے یاسر جواد لکھتے ہیں:

> "ہیرا منڈی لاہوریوں پر مسلسل اپنے نغمے نچھاور کرتی رہی۔ شام کے وقت یہ مقام خوش طبعی اور قہقہوں کا مرکز بن جاتا۔ سورج غروب ہوتے ہی لوہاری دروازے کے باہر انارکلی کی گزرگاہوں پر، جہاں بہت سے ریسٹورنٹ اور شراب خانے واقع تھے، ٹانگوں کی قطاریں لگ جاتیں جو نشاط پرستوں کو انکی منزل تک پہنچا آتے"(۲۶)

یہ جگہ اب ویسی بالکل نہیں رہی۔ اب بدنامی کے سارے راستے اس بازار کی طرف کھلتے ہیں۔ یہاں ایک دور ایسا تھا جب یہاں رات بھر موسیقی کی محفلیں سجا کرتی تھیں اور پھر آہستہ آہستہ جسم فروشی کا کام شروع ہو گیا۔ اب لوگوں نے اوپر والی منزل پر طوائفوں کو رکھا ہے جو صرف یہاں دھندا کرتی ہیں اور نیچے خود رہتے ہیں۔ ہیرا منڈی اب موچی منڈی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اب یہاں بہت بڑی موچی منڈی آباد ہے یہاں صرف نام کی طوائیفیں رہ گئی ہیں۔ چند ایک پرانی طوائفوں کے علاوہ لوگ یہاں سے دوسرے علاقوں میں منتقل ہو گئے ہیں اور اپنا کام دھندہ وہاں پر کرتے ہیں۔

اب ہیرا منڈی میں کھانے پینے کے بہت سے ہوٹل مشہور ہیں جن میں پھجے کے پائے، تاج محل سویٹس ، باؤ باربی کیو، مالا مرغ چنے اور پائے وغیرہ بڑے مشہور ہیں۔ اس کاروبار زندگی کے ساتھ ساتھ اب صرف ہیرا منڈی میں برائے نام دھندا کیا جاتا ہے۔ چند ایک گھروں کے اندر صرف دو یا تین لڑکیاں ہوتی ہیں جو اپنا پیٹ پالنے کی خاطر آتی ہیں اور بڑی مشکل سے گزر بسر کرتی ہیں۔ اب یہاں پر موسیقی اور رقص کے چاہنے والے کبھی نہیں آتے ابھی یہاں صرف ٹائم لگانے والے لڑکے آتے ہیں۔ اپنا کام کیا اور راستہ ناپا اور چلے گئے۔ اس منظر کو مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "وہ بہت خاموش گلیاں تھیں۔ یہ خاموشی ہمیشہ اس کی یاداشت میں سنسناتی رہی۔ وہ بند کھڑکیوں اور دروازوں کو بغور تکتا جن کے عقب میں مردوں پر جادو کر دینے والی حسین

> طوائفیں رہتی تھیں۔ یہ بند دروازے ایک دوسری دنیا میں کھلتے تھے جو اس کے تخیل میں بہت پراسرار مگر نہایت دلچسپ اور رنگین تھی۔ جس میں گھنگروں کی چھن چھنا چھن، طبلوں دھم دھمادھم ،ہارمونیم کی ریں راں ریں، پھلوں کے گجرے، شراب ،نوٹ، گلوریاں، گاؤ تکیئے، حسین عورتیں اور مخمور تماشبین موجود تھے۔ لیکن یہ دنیا کہیں دور واقع تھی۔ اس کی پہنچ اور رسائی سے ماورا اور اس کے کیے ممنوعہ "[۲۷]

مصنف نے ہیرا منڈی کا ذکر کر کے قارئین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ہم نے اپنی ثقافت کو کھو دیا۔ اگر چند فیصلے کر کے اس کام پر پابندی لگائی گئی ہے جو کہ اصل میں اس سسٹم کی ناکامی ہے۔ یہی کام اب پورے شہر لاہور میں جگہ جگہ پھیل گیا ہے اور لوگ اپنی ثقافت اور تہذیب سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ ہیرا منڈی صرف بدنام گلیوں کے سوا کچھ نہیں رہی۔

سمن آباد:

لاہور شہر کا علاقہ سمن آباد یتیم خانے سے تھوڑا آگے اور چوبرجی کے قریب ایک بہت پرانی بستی کی شکل میں آباد تھا۔ اب اس کی کافی ڈویلپمنٹ ہو چکی ہے اور یہ علاقہ ڈبل روڈ کے ساتھ تک پھیل چکا ہے۔ سمن آباد کے علاقے میں ویسے تو زیادہ تر نئی عمارتیں موجود ہیں جو ساٹھ اور ستر کی دہائی میں بنائی گئی تھیں اور کچھ زیادہ جدید عمارتیں اسی صدی میں بنائی گئی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر کافی قدیم عمارتیں بھی موجود ہیں ان میں خاص اہمیت کی حامل مغل دور حکومت اور گریٹر مغل دورِ حکومت کی تاریخی عمارتیں ہیں۔ اس دور کی رہی سہی جتنی بھی عمارتیں موجود ہیں وہ کافی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہیں اور سیاحوں کی نظر سے اوجھل ہیں۔ جو بھی لوگ سیاحت کی غرض سے لاہور شہر کا رخ کرتے ہیں وہ عام طور پر شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد، مینارِ پاکستان، اقبال پارک کی طرف جاتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں دیکھ پاتے کہ جنوبی لاہور کے اندر بھی مغل دور کی بہت خوبصورت عمارتیں موجود ہیں۔ یہ علاقہ بنیادی طور پر لاہور کے ایک ایسے علاقے میں ہے جہاں عام طور پر لاگ جانا پسند نہیں کرتے:

"سبھی کو عدالت نے سزا سنائی تھی۔ جیلوں میں ایسے قیدیوں کے ساتھ جو سختیاں روا رکھی جاتی ہیں اس کی داستانیں بھی عام تھیں ۔ جیل جانے کا تصور ہی انہیں لرزا دیتا۔ نورین اپنے بھائی کے گھر سمن آباد چلی گئی پولیس وہاں نہیں آئی۔ حالاں کہ عدالت نے اسے بھی سزا سنائی تھی"(۲۸)

اس علاقے میں ایسے آثار آج بھی موجود ہیں جن سے زیب النساء کے محل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ علاقہ زیب النساء کے محل کے مضافات کا علاقہ ہے۔ سمن آباد کے علاقے سے زیب النساء کی بہت ساری یادیں جڑی ہوئی ہیں اور کچھ آثار آج بھی اس علاقے میں موجود ہیں۔ اورنگزیب کی سب سے لاڈلی بیٹی ہونے کی وجہ سے زیب النساء نے باپ سے الگ باغ بنوانے کا کہا۔ اورنگزیب نے بیٹی کے لیے جو محل بنوایا وہ کافی رقبے پر محیط تھا۔ اس وجہ سے یہ چوبرجی کے علاقے سے شروع ہو کر سمن آباد تک پھیلایا گیا تھا۔ اس حوالے سے بھولا ناتھ وارث اپنی کتاب "تاریخ شہر لاہو" میں لکھتے ہیں:

" زیب النساء اورنگزیب دی لاڈلی دھیی سی۔ کتھے جاندا سی اوس نوں نال لے جاندا سی۔ اورنگزیب جد لاہور آیا تے دھی نوں نال لیایا۔ زیب النساء نے نویں کوٹ اپنے رہن لئی محل بنوایا۔ اوس دے پاس اک باغ لوایا۔ باغ اجڑ گیا پر سامنے داپھاٹک چوبرجی ہن تیکر موجود ہے"(۲۹)

مصنف نے سمن آباد کے علاقے کو ناول میں اس انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری اس علاقے کو اچھی طرح جان لیتا ہے کہ ہمارے لاہوری معاشرے میں رہنے والے لوگ ان چیزوں کو سنبھال کر نہیں رکھا۔

انارکلی بازار لاہور:

پاکستان کے صوبہ پنجاب کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کے اندر انارکلی بازار اپنی چہل پہل، رونق اور اپنے دلکش، حیرت افزا و شگفتہ نام کی وجہ سے بہت مشہور و معروف ہے۔

اگر لاہور کی بات کریں تو انار کلی بازار کو شہر لاہور کا سب سے اہم اور تاریخی بازار کہا جا سکتا ہے اور اس شہر کی انفرادیت اور اہمیت انیسویں صدی سے ہی مسلمہ ہے۔ انگریزی دور حکومت میں اس جگہ فوجی چھونیاں موجود تھیں اور اس وقت اسے رسالہ بازار کہا جاتا تھا۔ موجودہ لاہور شہر کا بازار حسن بھی پہلے انار کلی کے وسط میں موجود تھا۔ انار کلی بازار لاہور شہر کا سب سے بڑا پر رونق حصہ ہے۔ اس کا نام انار کلی کیسے پڑا اس کا ذکر ہوتے ہی مغلیہ باد شاہوں کے اخلاق کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس حوالے ماسٹر امر ناتھ لکھتے ہیں:

> "اکبر کی معشوقہ کا نام انار کلی تھا۔ جہانگیر کی آنکھ انار کلی سے لڑ گئی۔ دونوں محبت کی زنجیر میں بندھ گئے۔ اکبر نے ایک روز قد آدم آئینہ میں سے ان کی محبت کی نظریں ایک دوسرے پر پڑتی دیکھ لیں۔ اس پر انار کلی کو قبر میں زندہ دفن کر دیا گیا۔ جب جہانگیر بادشاہ ہوا تو اس نے انار کلی کے نام پر بازار تیار کرایا۔ جس کا نام انار کلی رکھا گیا"(۳۰)

انار کلی شہر کی اہمیت کے حوالے سے بہت عجیب بات یہ ہے کہ انار کلی کی اہمیت عالمگیر ہے۔ اسی مناسبت سے نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان کے باشندے یہاں تک کہ اہل لاہور خود بہت کم آگاہ ہیں۔ اس حقیقت کا تو شاذونادر ہی کسی کو گمان ہو گا کہ انار کلی ایک ایسی عورت تھی جو کہ اپنی خوبصورتی اور دل آویز رویے کی وجہ سے اکبری محلوں کے اندر شاہی بیگمات اور شہزادیوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔

انار کلی کا اصل نام نادرہ بیگم تھا۔ شاہی کنیزوں میں اکبر کی سب سے خوبرو اور حسین و جمیل کنیز تھی۔ اپنے حسین و جمیل چہرے کی بدولت اکبر کی اس قدر منظور نظر تھی کہ شاہی کنیزیں اس کے رسوخ و اقرار اور عروج و اقبال سے خوف زدہ رہتی تھیں۔ اس کا چہرہ گل رعنا کی مثل خوبصورت تھا اسی مناسبت سے بادشاہ نے اس کا نام انار کلی رکھ دیا۔ اس کی خوبصورتی کا جال شہزادہ سلیم کو بھی اپنی گرفت میں لے کر اڑ گیا اور یہ خفیہ محبت زیادہ دیر تک چھپ نہ سکی اور آخر کار یہ راز بھی افشاں ہو گیا۔

چند ہی دنوں میں یہ خبر بھی بادشاہ اکبر کے کانوں کی زینت بن گئی یہاں تک کہ ایک دن بادشاہ شیش محل کے اندر بیٹھے تھے کہ انار کلی بھی آن وارد ہوئی اور پیچھے پیچھے شہزادہ سلیم بھی ادھر کو نکل آئے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو ایک دوسرے کی نظروں میں محو ہو گئے یہاں تک کہ بادشاہ کی موجودگی کو چنداں یاد نہ رکھا۔ اکبر بھی

ایک دور رس انسان تھا اور تمام باتیں جو کہ بظاہر معلوم نہیں ہو رہی تھیں۔ انہیں اکبر بھانپ گیا اور بادشاہ نے خود تصدیق کرلی جو کہ اسے بتائی جاتی تھیں۔ یہ جرم ناقابل معافی تھا شاہی کنیز شاہزادے سے معاشقہ کرے۔ آخر کار بادشاہ اکبر نے فیصلہ سنا دیا اگر چہ اکبر بڑا رحم دل بادشاہ تھا لیکن بادشاہ یہ جرم معاف نہ کر سکا۔ اکبر نے انار کلی کو زندہ دیوار میں چنوائے جانے کا حکم دے دیا۔

خوبرو انار کلی جس کے دلکش حُسن سے شاہی بیگمات کا سورج ماند پڑھ رہا تھا۔ انار کلی کی ایک ایک ادا پر شہزادہ اپنی جان قربان کرنے کو ہمہ وقت تیار تھا۔ تقدیر نے کچھ اور فیصلہ کیا اور اسے زندہ در گور کر دیا گیا۔ حکمِ شاہی کی تعمیل میں انار کلی کو لاہور کے اس مقام پر جہاں آج بھی مقبرہ انار کلی کی تاریخی عمارت اشک حیرت بہا رہی ہے، کھڑا کر کے اس کے ارد گرد اینٹوں کی دیوار یار چن دی گئی۔ انار کلی نے اسی دیوار کے اندر جان دے دی۔

جب والد کی وفات ہوئی تو شہزاد سلیم نے اس جگہ کا پہلا دورہ کیا اور محبوبہ کی جائے مدفن پر ایک عالیشان مقبرہ اور ایک وسیع و عریض باغ بنانے کا حکم جاری کیا۔ اس عالی شان اور تاریخی عمارت کی چھت پر جس کے سینے میں حسن و عشق کی جیتی جاگتی تصویر مدفن ہے۔ ایک بہت ہی بلند گنبد بنایا جو مغلیہ عہد قدیم کا فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ حکومتوں کی تبدیلی اور وقت کی کروٹوں کے ساتھ ساتھ اس عمارت میں بھی ردبدل جاری رہا۔ سلیم کے حکم سے اس میں باغ بھی تعمیر ہوا جو کہ بعد میں ویران ہو گیا۔

یہ بازار دو حصوں میں منقسم ہے پرانی انار کلی اور نئ انار کلی۔ پرانی انار کلی مال روڈ کے جنوب میں واقع ہے اور نئ انار کلی مال روڈ پر واقع انار کلی چوک سے شمال میں سر کلر روڈ پر مسلم مسجد تک ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے انار کلی بازار میں مسلمانوں کی چند ایک دکانیں تھیں اور باقی تمام تجارت ہندو ساہوکاروں کے پاس تھی۔ مگر جب وہ یہاں سے رخصت ہوئے تو تمام صورتحال ایک دم بدل گئی اور اب ہزاروں تاروں بھری جگمگ جگمگ کرتی دکانوں پر مشتمل یہ بازار مسلم تاجروں کی خوشحالی بہت ہی بڑا مرکز بن گیا۔ انار کلی کی چہل پہل اور رونق کے حوالے سے طاہر لاہوری اپنی کتاب "سوہنا شہر لاہور" میں لکھتے ہیں:

> " لاہور صدیوں سے خوبصورت نگری ہے، علم و فضل کا شہر ہے۔ خوبصورت باغوں، خوبصورت آبادیوں، خوب صورت عمارتوں اور خوبصورت لوگوں کا شہر ہے۔ انار کلی بازار

صدیوں سے اپنے حسن کی بھرپور رعنائیوں کے ساتھ زندہ ہے گویا لاہور کا ڈیکوریشن پیس ہے۔ صدیوں پہلے یہاں پر قبرستان تھا۔ سیکرٹریٹ سے انارکلی تک اب بھی بیسیوں پرانی قبریں اور مزاریں ہیں"(۳۱)

اسی طرح محمد عاصم بٹ نے اپنے ناول "دائرہ" میں انارکلی بازار کی خوبصورتی اور گہما گہمی کو اگرچہ مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ عاصم بٹ نے اپنے ناول میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری جوان نسل کس طرح ان تاریخی بازاروں اور تاریخی مقامات سے انجان زندگی گزار رہی ہے۔ وہ ان تاریخی بازاروں کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو جاننے سے قاصر ہیں کہ آیا ان بازاروں کی موجودہ خوبصورتی کس دور کی دین ہے۔

ویسے تو پاکستان کے اکثر بڑے شہروں میں انارکلی بازار موجود ہیں لیکن عاصم بٹ نے لاہور شہر کے انارکلی بازار کے حوالے سے بہت عمدہ صورت گری کی ہے۔ کس طرح سے لوگ یہاں کا رخ کرتے ہیں اور رات گئے تک یہاں بیٹھ کر کس طرح کی باتیں کرتے ہیں اور کیسے کیسے تجزیے پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے ناول میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"وہ حسب معمول تیار ہو کر بوٹاٹی سٹال پر احمد علی اور رحیم بخش سے ملنے جا رہا تھا۔ جہاں بیٹھ کر وہ چائے اور سگریٹ پیتے یا پھر سڑکوں یا باغوں میں مٹر گشت کرتے حتی کہ اچھا خاصہ وقت گزر جاتا اور شام ہو جاتی جو بہت سے دوسرے ساتھیوں کو کشاں کشاں انارکلی بازار میں بوٹاٹی سٹال کی طرف لے آتی اور پھر وہاں محفل جمتی جو رات گئے تک رہتی"(۳۲)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستانی ثقافت کے میں ان بازاروں کا کیا کردار ہے۔ دنیا کے دوسرے معاشروں میں اکثریت لوگوں کی شام کے بعد گھروں میں مقید ہو جاتی ہے اور اپنے بیوی بچوں میں وقت گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں جبکہ پاکستانی لوگ ایسی بے شمار جگہوں پر رات گئے جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کا حال معلوم کرتے ہیں اور آپس میں دکھ سکھ بانٹتے ہیں۔ عاصم بٹ نے ایک تاریخی بازار کا سہارا لے کر بڑی چابکدستی کے ساتھ پاکستانی ثقافت کا ایک نادر رخ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

اردو بازار:

لاہور شہر کا اردو بازار انار کلی بازار کے بلکل قریب اور موری دروازے کے سامنے واقع ہے۔ شروع میں لوہاری اور بھاٹی گیٹ کے پرانے تمام علاقے اردو بازار کے بالکل نزدیک تھے۔ اس بازار کو مغل دور میں موہن لال نے آباد کیا تھا۔ اس وقت سے لے کر قیام پاکستان سے پہلے تک یہ بازار موہن لال کے نام سے جانا جاتا تھا۔

اس وقت میں ایک دکان نئی دہلی گیٹ کے پاس واقع تھی۔ قیام پاکستان کے بعد اس نے پھلنے پھولنے کا عمل شروع کیا اور ۱۹۵۰ء میں اس کا نام تبدیل ہو کر اردو بازار پڑ گیا۔ لاہور شہر کے اندر ایک وقت میں یہ کتب کی سب سے بڑی مارکیٹ تھی۔ جب پہلی بار اردو بازار کا قیام عمل میں آیا تو اس میں صرف نالے پر چار دکانیں بنائی گئی تھیں۔ جن کی قیمت فی دکان صرف چار ہزار روپے تھی لیکن بعد میں کے ایم سی نے بہت ساری دکانوں کی ایک مارکیٹ بنادی اور یوں یہ علاقہ ایک پوری مارکیٹ میں تبدیل ہو گیا۔ اب ایک دکان کی قیمت تقریباً چار کروڑ روپے ہے۔

اب اس طرح کی مارکیٹیں لاہور شہر کے اندر اور بن گئی ہیں۔ جگہ جگہ مارکیٹیں بننے سے اردو بازار اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔ اب یہاں سے ملنے والی نایاب کتب شہر کے کئی علاقوں میں مل جاتی ہیں۔ عاصم بٹ کے پیش کردہ کردار اور مقامات منہ بولتی زمینی حقیقتیں ہیں۔ ان کے پیش کردہ مقامات بھی ایسے ہیں نہیں کہ قاری دیدہ ہو یا نادیدہ وہ بھی لاہور کی سیر کرنے لگتا ہے۔

جیسا کہ اردو بازار کا تذکرہ آتا ہے تو انسان جو کہ تھوڑا بہت بھی اگر پڑھنے لکھنے سے شغف رکھتا ہے اسے فوراً مختلف کتب خانوں کی سیڑھیاں، بکس کارنر، الماریاں دھڑا دھڑ اپی ایم ایس، سی ایس ایس، اور دوسری بنیادی ، تعلیمی، عمومی، قانونی اور مخصوص کتابیں میزوں پر نظر آتی ہیں۔ عاصم بٹ اردو بازار کی رونقوں کے حوالے سے لکھتے ہیں

> "پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد نورین کا داخلہ مسلم ماڈل سکول میں ہو گیا جو پرانے شہر کے قدیم دروازوں سے باہر اردو بازار میں واقع ہے۔ بارہ دروازوں کی دنیا باہر کی دنیا سے بہت مختلف تھی، سمند میں ایک چھوٹے سے جزیرے کی مانند۔ اس جزیرے کی

آب و ہوا، عمارتیں، لوگوں کا رہن سہن، رسوم و رواج اور ان کا مزاج۔ یہ سب کچھ بارہ دروازوں کی دنیا سے میل نہیں کھاتا"(۳۳)

عاصم بٹ نے اردو بازار کو لاہور کے دل کی طرح پیش کیا ہے۔ اگر اردو بازار کا تذکرہ نہ کیا جائے تو اردو کا تذکرہ نہ کرنا ہے۔ لہذا وہ اردو بازار کا تذکرہ کر کے خلاف حقیقت لاہور کی کتابی تاریخ کو اجاگر کرتے ہیں۔ پوری سلطنت مغلیہ کا خورشید ہندوستان کے افق پر درخشاں نظر آتا ہے۔ اکبر اور شاہ جہاں کے دور میں اس طرح شکری بازار اور پھر اردو اور پھر اردو معلی کا نام دیا گیا۔ اس اردو کی محبت میں اردو بازار نے جنم لیا جو کہ ایک نالے پر چار دکانوں پر مشتمل بازار تھا اور پھر دیکھتے دیکھتے ایک مباحثانہ سرگرمیاں اور پھر پورا اردو بازار وجود پذیر نظر آتا ہے۔

ناول "بھید" میں لاہور شہر کے مقامات کا تجزیہ

پیر بھولے شاہ کا مزار:

پیر بھولے شاہ کا مزار چوک لوہاری منڈی سے سوتر منڈی کو جائیں تو کوچہ پیر بھولے شاہ مشہور ہے۔ اسی جگہ روڑ کے دائیں جانب بھولے شاہ کا مزار ہے۔ آپ شروع سے ہی پیر بھولے شاہ کے نام سے مشہور تھے۔ پیر بھولا صاحب و کشف و کرامات تھے۔ آپ ہر وقت بچوں سے کھیلتے رہتے تھے۔ اکثر بڑی عمر کے لوگوں سے آپ بات نہ کرتے اور اور جو لوگ نذرونیاز آپ کو دے جاتے وہ سب آپ بچوں میں بانٹ دیتے تھے۔ اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

> "پیر بھولے شاہ کے مزر پر چراغ بجھنے نہیں پاتے۔ شام کو جلائے جانے والے چراغ ابھی جل رہے ہوتے کہ رات کو پھر ان میں کوئی تیل بھر جاتا۔ منتیں ماننے والوں نے دیے کی لو سے پریت لگائی ہوتی"(۳۴)

آپ گلی کوچوں میں اکثر گھومتے رہتے تھے۔ جہاں بھی جاتے بچے آپ کے پیچھے پیچھے رہتے تھے۔ اہل دنیا سے آپ کو کوئی لگاؤ نہیں تھا بلکہ آپ نفرت کرتے تھے۔ حضرت پیر بھولے شاہ کے مزار پر ان کے عقیدت مند بہت تعداد میں آج بھی آتے ہیں۔ یہاں آکر اپنی منتیں مانتے ہیں۔ لاہوری تہذیب و ثقافت میں مزاروں ،درباروں اور درگاہوں وغیرہ کی چہل پہل رہتی ہے۔ دوردور کے علاقوں سے لوگ یہاں آکر مراد مانتے ہیں اور نوافل ادا کرتے ہیں۔ اپنے بزرگوں سے محبت کا اظہار لوگ ان کے درباروں پر چادر چڑھا کر کرتے ہیں۔

ان کی قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں ان درباروں پر چوبیس گھنٹے لنگر خانے چلتے رہتے ہیں اور امیر لوگ ان لنگر خانوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں۔ پیر بھولے شاہ ایک مجذوب آدمی تھے۔ آپ لوگوں کی باتوں کا بہت جلد برا مان جاتے تھے۔ پیر بھولا مجذوب لوگوں کو جو بھی دعا دیتے اللہ تعالی اس کو قبول فرما

لیتے۔ پیر بھولے شاہ اپنے دوستوں میں بھی بہت غصے والے مانے جاتے تھے۔ کسی بات پر ایک دفعہ اڑ گئے پھر اپنا فیصلہ بدلنا ان کے لیے ناممکن سا ہو جاتا تھا۔ اسی حوالے سے طاہر لاہوری اپنی کتاب "بلاد الاولیاء" میں لکھتے ہیں:

> "لوگوں کا کافی ہجوم تھا۔ اچانک اس مجلس میں میاں مونگر آ گئے اور حضرت بھولے شاہ کو مخاطب کر کے بڑے غصے سے فرمایا۔ تم یہاں کیوں آئے ہو تمہارا ان لوگوں سے کیا واسطہ ہے کیا تعلق ہے۔ یہ سن کر حضرت مجلس سے اٹھ کر بھاگ گئے میاں مونگر بھی ان کے پیچھے بھاگے "(۳۵)

حضرت پیر بھولے شاہ اپنے اس علاقے میں کافی مشہور و معروف بزرگ اور پیر تھے۔ آپ لوگوں سے زیادہ بات نہیں بھی کرتے تھے پھر بھی آپ کے عقیدت مند ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ پاکستان میں درباروں کا ایک خاص کلچر ہے جو کہ یہاں کے رہنے والے لوگوں کی پہچان میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لوگ ان اولیاء اللہ کے توسط سے اپنی منتیں مانتے ہیں اور خدا سے رابطہ کرتے ہیں۔

بنات کالج:

لاہور شہر کے اندر بنات کالج ایک بہت بڑا ادارہ ہے جو لڑکیوں کی تعلیم میں ہمہ وقت سرگرم دکھائی دیتا ہے۔ بنات کالج نیلا گنبد کے اندر پانی والی بڑی سبیل کے عین سامنے اور اونچے دروازے والی کھنڈر نما ایک پرانی عمارت میں واقع ہے۔ یہ عمارت ایک زمانے میں کسی امیر زادے کی حویلی تھی۔ بنات کالج کو حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

> "بنات کالج ،نیلا گنبد میں پانی والی بڑی سبیل کے برابر ،چوڑے اور اونچے دروازے والی کھنڈر نما عمارت میں واقع ہے جو کبھی کسی امیر زادے کی حویلی رہی تھی اس حویلی کے دیوانِ خاص میں کالج کا اسٹاف بیٹھتا ہے جہاں پر خوبصورت کھڑکیوں سے ہلکے نیلے رنگ کی روشنی پورے ہال میں آتی ہے "(۳۶)

اس عمارت کے اندر ایک بہت بڑا ہال ہے جو کالج کی مختلف تقریبات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس ہال کی چھت گنبد نما ہے اور گنبد میں رنگ دار شیشے کی ٹکڑیاں اس انداز میں لگی ہوئی ہیں کہ ایڑی پر گھوموں تو ایک جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ بار بار گھومنے سے ان کا رنگ بھی تبدیل ہوتا ہے۔ کبھی نیلا، کبھی پیلا اور کبھی لال۔ ایک دور میں یہ رنجیت سنگھ کی کسی چہیتی طوائف کی رہائش گاہ بھی رہی تھی بعد میں جب انگریز قابض ہوا تو اس نے اسے مال خانے میں تبدیل کر دیا۔ مغل دور حکومت کی بنائی گئی دوسری عمارتوں کی طرح بنات کالج والی عمارت بھی اسی طرز پر بنائی گئی۔ اس عمارت کے اندر شیشوں اور سنگ مرمر جیسے قیمتی پتھر کا استعمال شاہ جہاں کے عہد کی یاد تازہ کرتا ہے۔ عہد مغلیہ میں عمارتوں کا ایک خاص اسلوب تھا جو کہ شاہ جہاں کو بہت پسند تھا۔ اس حوالے سے عتیق انور لکھتے ہیں:

> "مغل دور کے ہندوستان میں آتے ہی ۱۵۲۶ء کے بعد اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں بادشاہوں کے زمانے میں بنی ہوئی عمارتوں میں سنگِ مرمر، محرابوں میں کاری گری اور قیمتی پتھروں کو دیواروں میں چسپاں کر کے بچہ کارہ اور میناکاری کا کام ابھر کر سامنے آیا۔ دوہرے گنبد کا وجود ہوا"(۳۷)

اس ہال کی پچھلی جانب ایک خوبصورت کشادہ صحن ہے اور درختوں سے اٹا ہوا ایک باغ بھی۔ اس عمارت کی دو منزلیں ہیں اور ان میں ان گنت کھڑکیاں، کمرے، روشن دان، جگہ جگہ دیواروں پر بیرونی اور اندرونی جانب چھوٹے چھوٹے آلنے بھی بنے ہوئے ہیں جو کہ پرندوں کو موسمی عارضے سے بچاتے ہیں اور ان میں چراغ بھی جلائے جاتے ہیں۔ کھڑکیوں کے شیشے لہر داریں اور چھت پر نقش و نگار بھی بنے ہوئے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت یہ عمارت مہاجرین کی قیام گاہ تھی۔ بعد میں حکومت نے اسے کالج میں تبدیل کر دیا۔

اس کالج کے اندر ایم اے تک جدید دور کے تمام مضامین میں تعلیم دی جاتی ہے۔ نصابی سرگرمیوں کے علاوہ اس میں غیر نصابی سرگرمیاں بھی جاری رہتی ہیں۔ ایک طرف بڑے میدان میں والی بال گراؤنڈ، کرکٹ گراؤنڈ اور فٹ بال گراؤنڈ بھی بنا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بوسیدہ عمارت میں لائبریری بھی ہے جسے نئے سرے سے تعمیر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ لاہور شہر کے اندر یہ تعلیمی ادارہ تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کو ان کے تاریخی

ورثے کی اہمیت کے بارے میں بھی آگاہ کرتا ہے۔ بنات کالج کی عمارت مغل دور حکومت کی شاندار نشاندہی کرتی ہے جو لاہوری تہذیب و ثقافت کی ایک زندہ مثال ہے۔

برٹش کونسل:

برٹش کونسل ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جو تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک برطانوی ادارہ ہے جو ایک سو سے زائد ممالک میں اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ برٹش کونسل پر شاہی چارٹر چلتا ہے جو ایک کارپوریشن کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔

۱۹۳۴ء میں انگریزی تعلیم کی تائید، فاشزم اور برطانوی ثقافت کو فروغ دینے کے لیے برطانوی عہدے داروں نے دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی تشکیل دی جو بعد میں برٹش کونسل کے نام سے مشہور ہوئی۔ سب سے پہلے ۱۹۳۸ء میں رومانیا، مصر اور پرتگال میں برٹش کونسل کے دفاتر کھولے گئے۔ ۱۹۴۰ء میں شاہ جارج ششم نے دوسرے ممالک کے ساتھ مل کر انگریزی زبان اور تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لیے شاہی چارٹر دیا۔ سائنسی، ثقافتی، تعلیمی اور تکنیکی تفہیم اور تعاون کی حوصلہ افزائی برطانوی تعلیم، قابلیت اور مہارت، ثقافت اور معاشرے تک رسائی کے ذریعے لوگوں کی زندگیوں کو تبدیل کرنا اس کا اہم مقصد رہا ہے۔

لاہور شہر کے اندر برٹش کونسل کا ادارہ گزشتہ اکیاون سال سے کام کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے کئی بڑے شہروں میں بھی یہ ادارہ اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اس ادارے میں بہت بڑی لائبری کے ساتھ ساتھ چھوٹے بچوں کے لیے بھی الگ سہولیات ہیں۔ جہاں پر جا کر وہ اپنی سرگرمیاں سرانجام دیتے ہیں۔ کونسل لائبریری میں بارہ ہزار کتب موجود ہیں اور سات ہزار ڈی وی ڈیز فلمیں بھی ہیں جو علمی اور ثقافتی ورثے سے بھری ہوئی ہیں۔ جدید دور کے تقاضوں سے لبریز کمپیوٹر لیب بہترین نظام کے مطابق کام کر رہی ہے۔ برٹش کونسل لائبریری کی خوبصورتی اور اس کے آرام دہ ہونے کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

> "برٹش کونسل کا ریڈنگ روم اس خطہ لاہور میں سمجھیئے کہ ایک قطعہ جنت ہے۔ دوپہر میں سفید آگ سے آنکھیں چندھیانے اور ماس جلنے لگے تو اس میں برٹش کونسل

> کی عمارت سرخ نہیں بلکہ سبز معلوم ہوتی ہے اور اس کے اندر دل جیسا دھڑکتا ہوا ریڈنگ روم اپنی آغوش میں لینے کی بے چینی میں مبتلا عمارت سے باہر نکل نکل پڑتا ہے۔وہ آپ کو لوری سناتا ہے، مسکراتا لبھاتا اور اپنا دیوانہ بنالیتا ہے"(۳۸)

باہر ایک خوبصورت گارڈن ہے اور اس گارڈن کے احاطے میں وائی فائی کی سہولت بھی موجود ہے۔ صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک یہ لائبریری کھلی رہتی ہے اور لوگ یہاں آکر کتب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ پاکستان کے شہر لاہور کے اندر پاکستانی تہذیب و ثقافت سے روشناس کروانے والے اداروں میں برٹش کونسل ایک اہم ادارہ ہے۔اس ادارے کے تحت مختلف مواقعوں کے حوالے سے پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں۔

بائبل سوسائٹی:

برٹش کونسل لائبریری کی عمارت سے تھوڑا پیچھے بائبل سوسائٹی کا علاقہ ہے۔یہ علاقہ اپنی خاص پہچان کے حوالے سے بڑا مشہور ہے کہ یہاں پر لنڈا بازار سے ملنے والی اشیاء اسی قیمت پر ملتی ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا لنڈا بازار ہی ہے۔ اس کے ایک طرف اولڈ بک بازار ہے جہاں سے پرانی کتابیں آدھی یا اس سے بھی کم قیمت پر مل جاتی ہیں۔ اس حوالے سے مصنف ناول میں یوں لکھتے ہیں:

> "اسحاق ٹیلرز کے سامنے بائبل سوسائٹی ہے جس کی دیوار کے ساتھ ساتھ پرانے ملبوسات کی عارضی دکانیں قائم کی گئی ہیں۔ میں اپنے لیے وہاں جرابیں چیک کر رہا تھا جو لچک دار ہوں، زیادہ موٹی نہ ہوں، ریشمی تو بلکل نہ ہوں، پسینہ جذب کر لیں ،اور بہتر ہے جالی دار ڈزائین کی ہوں"(۳۹)

بائبل سوسائٹی قدرے پسماندہ علاقہ ہے۔ اس علاقے میں زیادہ تر ٹیلرز اور موچیوں کی دکانیں ہیں۔ اس کے علاوہ روزمرہ کی کاروباری سرگرمیاں اس علاقے میں ضرور جاری رہتی ہیں۔ لاہور شہر کے باقی علاقوں کی طرح سڑکیں یہاں بھی پکی ہیں اور رات کے وقت سٹریٹ لائٹس بھی چلتی رہتی ہیں۔ اس علاقے میں پلازے بھی موجود ہیں لیکن بیس بیس منزلہ عمارتیں اس علاقے میں نظر نہیں آتیں۔ یہ ایک رہائشی ہب ہے جس میں تین سے چار منزلہ

زیادہ عمارتیں ہیں جن میں لوگ اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔اس علاقے میں رہنے والے زیادہ تر لوگوں کا تعلق لاہور کے مڈل کلاس معاشرے سے ہے۔

ہیلے کالج:

لاہور شہر کے اندر پنجاب یونیورسٹی ۱۴اکتوبر ۱۸۸۲ء کو بنائی گئی۔ اس یونیورسٹی کا آئیڈا سر چالس وڈ نے پیش کیا تھا جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف سٹڈیز کے ممبر تھے۔ اس سے قبل ہندوستان میں تین یونیورسٹیاں کام کر رہی تھیں۔۱۹۴۷ء سے قبل یہ یونی ورسٹی اس خطے کے لوگوں کو یکساں تعلیمی سہولیات فراہم کر رہی تھیں۔

اس یونیورسٹی کا ایک حصہ کالج کی حیثیت سے کام کر رہا ہے جو کہ پہلے اسی میں شامل تھا۔ دراصل کالج کو پنجاب یونیورسٹی کا ہی ایک حصہ کہنا مناسب ہے۔اس کالج کی عمارت سر گنگارام نے عطا کی تھی۔اس وقت عمارت کے ساتھ ساتھ بہت بڑا ہاسٹل بھی تھا جہاں طلبہ کے لئے رہائش کا معقول انتظام تھا۔ بعد کے دنوں میں یونیورسٹی کی انتظامیہ نے ایک اور ہال، دو کمرے اور ایک نیا ہال بھی تعمیر کیا۔ ہیلے کالج کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

> "وہیں فٹ پاتھ پر مشتاق چھرا کھڑا تھا میں نے اس سے ہیلی کالج کا پتہ پوچھا۔اس نے ایک پرانی عمارت کی طرف اشارہ کر کے چہرے کو موڑا، بھوؤں کا سکوڑا، ٹھوڑی کو دائیں بائیں جھٹکا، اور یوں اشاروں سے مجھے بتایا کہ کبھی اچھے وقتوں میں اس پرانی عمارت کی بھی کیا شان ہوتی تھی، یہاں ایک بڑا کالج ہوا کرتا تھا جس سے لاکھوں لڑکے مستفید ہوئے، جسے انگریزوں نے بنایا تھا تاکہ مشرق کی اقوام نئی پیش رفت کی روشنی سے اپنے گھروں میں پھیلی ظلمت کا خاتمہ کر سکیں"(۴۰)

اس کالج کا سارا نظام یونیورسٹی دیکھتی ہے۔ یہ کالج ہمیشہ سے اپنے وقت کی جدید تعلیم کے حوالے سے کبھی پیچھے نہیں رہا۔ جدید سے جدید مضامین اس کالج میں ہر دور میں پڑھائے جاتے رہے ہیں ا۔ نگریز اساتذہ بھی اپنی خدمات اس کالج میں دے چکے ہیں۔ اس حوالے سے نقوش لاہور نمبر میں مصنف لکھتے ہیں:

"۱۹۵۳ء تک اس کالج میں بی کام نام تعلیم کی آخری منزل تھی لیکن ۱۹۵۴ء میں چند امریکی پروفیسروں کی آمد سے ایم کام کی ایک سالہ کلاس بھی جاری کر دی گئی۔ واشنگھٹن اسٹیٹ یونیورسٹی نے ایم کام کے لیے پروفیسروں کے علاوہ سینکڑوں کتابیں بھی دیں اور اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس کالج کے پروفیسروں کو مدعو کیا۔۔۔اس کالج کے طلبہ کو درس دینے کے لیے لاہور کے دوسرے کالج کے پروفیسر حضرات بھی تشریف لاتے ہیں"[۴۱]

موجودہ دور کے اندر کالج تعلیمی میدان میں ایک الگ شناخت کا حامل ہے۔اس کالج کے اندر طلبہ کی تعداد دس ہزار کے قریب ہے اور کئی پروگرام کالج میں بیک وقت جاری ہیں۔اس کالج کی لائبریری میں تقریبا پچیس ہزار کتب موجود ہیں۔اس کالج سے "الاقتصاد" کے نام سے ایک میگزین بھی جاری ہوتا ہے۔کالج یہ میگزین سال میں صرف دو مرتبہ جاری کرتا ہے جس میں طلبہ کی تحریروں کا ایک حصہ شامل ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ہیلی کالج میں ہر سال ایک ثقافتی میلا لگتا ہے جس میں لاہور شہر کی ثقافت کو مختلف سیشنز میں پیش کیا جاتا ہے۔

ظفروال:

لاہور شہر سے تھوڑا باہر فیصل آباد روڈ پر ایک بستی ظفروال کے نام سے جانی جاتی ہے۔یہ علاقہ کم شرح خواندگی والے علاقوں میں بھی آتا ہے۔یہاں کے رہائشی لوگ کافی لڑاکے مانے جاتے ہیں۔بدمعاش قسم کے لوگ یہاں کے رہائشی ہیں جیسے کہ سرگودھا کے کنوں، گجرانوالہ کے پہلوان، بہاولپور کی کھجوریں، گجرات کے پہلوان، پنکھے اور لاہور کے رنگ باز مشہور ہیں۔بالکل اسی طرح ظفروال کے بدمعاش مشہور ہیں۔یہاں پر رہنے والا ایک سے بڑھ کر ایک ہوشیار اور اتھرا لڑکا ہے۔کسی کو کوئی کام کاج نہیں۔ٹہکا شہکا، بڑھک مارنی، پہلوانوں کی طرح چوڑے سینے اور بازو کھول کر چلنا اور دن بھر شہر میں ادھر ادھر گھومتے رہنا ان لوگوں کا مشغلہ ہے۔

اس علاقے میں گجر، آرایں اور عوان برادری کے لوگ زیادہ تعداد میں بیٹھے ہیں۔لوگوں کے ساتھ دھوکا بازی کرنا، مال ہتھیا لینا، کسی کا حق کھا جانا ہے، کسی کو مار دینا، راہ زنی کرنا اس علاقے میں عام ہے۔اس علاقے میں لوگوں کے عجیب و غریب ذہنوں اور اس علاقے کی الگ پہچان کی عکاسی مصنف نے اپنے ناول میں یوں کی ہے:

"ظفر وال والے سڑک بننے کی جگہ جھگیاں ڈالے بیٹھے تھے۔کام رکا پڑا تھا۔چھ ماہ بعد ٹھیکیدار نے الٹا پبلک ورکس والوں پر مقدمہ دائر کر دیا۔اس نے سریا، سیمنٹ، بجری اور مشینری شروع میں ہی سب کی سب یک مشت خرید لی تھی یا کرائے پر لے لی تھی"(۴۲)

اس اقتباس سے پوری طرح لاہور شہر کے مضافات کے علاقوں کی صورت حال اور ان میں رہنے والے لوگوں کی تہذیب و ثقافت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے رہن سہن آپسی معاملات اور زندگی گزارنے کے طور اطوار کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے لوگوں کا عورت کے بارے میں تصورات اور اس سے کیے جانے والے برتاؤ کو بڑی چابکدستی کے ساتھ مصنف نے بیان کیا ہے۔ آج بھی کئی لوگ ایسے دیکھنے کو ملتے ہیں جو عورت کو نہوست گردانتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔

شاد آباد:

لاہور شہر کے شمالی علاقہ جات میں شاد آباد ایک عجیب و غریب وضع کی بستی ہے۔ جس میں بہت بڑی بیس بیس منزلہ عمارتیں ہیں جو ہزاروں کی تعداد میں فلیٹوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ان میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ رہائش پذیر ہیں اور کاروبار حیات چلا رہے ہیں۔

اس علاقے میں جہاں پر بڑی بڑی عمارتیں ہیں ساتھ چھوٹے چھوٹے مکان بھی نظر آتے ہیں۔ ان بیس بیس منزلہ عمارتوں کے فلیٹس میں زیادہ تر پرائیویٹ کمپنیوں کے دفاتر ہیں جن میں ہزاروں افراد روزانہ کی بنیاد پر کام کرنے کی غرض سے آتے ہیں۔ ان دفاتر میں زیادہ تر سٹوڈیوز، اخبار کے دفتر، ٹیکسٹائل انڈسٹری کے دفتر اور بے شمار کمپنیوں کے پرائیویٹ دفتر موجود ہیں۔ لاہور شہر کے بڑے بڑے تجارتی مراکز کے دفاتر اسی علاقے میں موجود ہیں۔ اس علاقے میں جدید دور کی تمام تر سہولیات ایک جگہ ملتی ہیں جو کسی بھی علاقے کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ شاد آباد کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

"اسی شہر لاہور کے شمالی علاقے میں شاد آباد ایک عجیب وضع کی بستی ہے جس میں بیس بیس منزلہ عمارتوں کا ایک جنگل ہزاروں فلیٹوں کو اپنے جلو میں لیے

ہوئے لاکھوں افراد کی رہائش گاہ بنا ہوا ہے۔ انہیں میں سے ایک فلیٹ، ایک سٹوڈیو فلیٹ اس بندہ ناچیز کا بھی ہے"(۴۳)

شاد آباد کے علاقے سے لاہور شہر کی وہ تصویر نظر آتی ہے جو کسی بھی ترقی یافتہ ملک کی ہو سکتی ہے۔ بڑی بڑی شاندار عمارتیں ،کارپیٹڈ روڈ، سڑکیں، جدید معیار کے مطابق ریسٹورنٹ، ٹک شاپس اور کافی شاپس وغیرہ۔ سڑک کے اطراف میں ایک ترتیب سے لگے ٹھیلے بھی خوبصورت منظر پیش کرتے ہیں۔ عاصم بٹ کے مقامات کو پیش کرنے اور لاہوری ازندگی سے جڑی حقیقت کو بیان کرنے کی صلاحیت کے حوالے سے حرا فاطمہ اپنے مضمون میں لکھتی ہیں:

"ناول میں شہر لاہور کی داستانوی تاریخ موجود ہے۔ یہاں کے علاقوں، محلوں، سڑکوں، گلیوں، بازاروں، دکانوں، کھانوں، کھیلوں محفلوں کی تفصیل جس انداز میں بیان کی گئی ہے اس بنا پر ناول کو "لاہور کی الف لیلی" کہنا بے جا نہ ہو گا"(۴۴)

عاصم بٹ نے ناول میں لاہور شہر کی جزئیات کو ایک پختہ فنکار کی طرح پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بیان کیا ہے۔ لاہور شہر کی پوری فلم قاری کی آنکھوں کے سامنے چلتی نظر آتی ہے۔

ٹیمپل روڈ:

لاہور شہر کے اندر قوئین روڈ کے ساتھ ٹیمپل روڈ واقع ہے۔ اس روڈ کے بالکل ساتھ اسلام پارک ہے جو کہ رقبے کے لحاظ سے شہر لاہور کے بڑے پارکوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس روڈ کے ایک جانب امرتسر روڈ اور دوسری جانب مزنگ روڈ ہے۔

لاہور جیسے تاریخی شہر میں ٹیمپل روڈ اپنی ایک الگ تاریخ اور شناخت رکھتا ہے۔ اس جگہ سکھوں کے ایک بہت بڑے گرو کا گردوارہ تھا جسے متی کولان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آج بھی سکھ یاتری بڑی تعداد میں یہاں آتے

ہیں۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یہاں سے فرار ہونے کا سوچا تو اس نے یہی راستہ چنا اور یہاں ایک ہیکل تعمیر کروایا جو ایک بہت بڑے درخت کے ساتھ تھا۔

اس درخت کے ساتھ سکھوں کے گرو نے ایک وقت میں اپنا گھوڑا بھی باندھا تھا جس وجہ سے سکھ لوگ اسے بڑی عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سکھوں کے گرو اور گردوارہ چٹی بادشاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ رنجیت سنگھ نے جس ہیکل کو تعمیر کرایا اسے از سرِ نو مرمت کی اشد ضرورت ہے۔ ٹیمپل روڈ اسے گردوارے اور مندر کی مناسبت سے کافی مشہور ہے اور اسے ایک تاریخی روڈ کی حیثیت حاصل ہے۔

شیش محل:

لاہور شہر کے اندر بے شمار تاریخی عمارتیں موجود ہیں جو مغلیہ دورِ حکومت کی جاندار تخلیقات ہیں اور اس کی پہچان بھی ہیں۔ لاہور شہر کے اندر شاہی قلعہ میں مغل دور کی خوبصورت عمارت ہے جو قلعہ کے شمال مغربی حصے میں واقع ہے۔

شیش محل کی عمارت شاہ جہان کے دور میں اس کے ذوق فن تعمیر کے مطابق بنائی گئی۔ اس عمارت پر سفید سنگ مرمر لگایا گیا اور اندرونی جانب پوری عمارت میں شیشوں کے ساتھ بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ اس محل کی عمارت صرف اور صرف سلاطین اور شہنشاہ کی رسائی کے ساتھ ساتھ ان کے عزیز و اقارب کی رسائی میں تھی۔

یہ عمارت مغل دور کی یادگاروں میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ شاہ جہان کو سنگ مرمر بہت زیادہ پسند تھا اس لیے اس نے عمارتوں پر سنگ مرمر لگوایا جن میں سے ایک شیش محل بھی تھا۔ شاہ جہان کے فن تعمیر پر تبصرہ کرتے ہوئے سر سید احمد خان "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں:

> "شاہ جہان کی تعمیر کردہ عمارتوں میں جلال سے زیادہ جمال ہے اور نفاست اور لطافت ہے۔ عہد اکبر کی عمارتیں عام طور سے سادہ اور آرائش سے عاری ہیں۔ اس کے برعکس شاہ جہان کی عمارتوں میں آرائش پر غیر معمولی زور ہے۔ اکبر کے زمانے کی عمارتوں میں لال

پتھر استعمال ہوتا تھا۔ شاہ جہان کو سنگ مرمر پسند تھا اور یہ پسند اس حد تک تھی کہ اس نے آگرہ کے لال پتھر سے بنی ہوئی عمارتیں گرا کر انہیں سنگ مرمر سے تعمیر کیا"(۴۵)

بادشاہ شاہ جہان کے عہد حکومت میں بے مثال اور خوبصورت عمارتیں بنائی گئیں۔ ان عمارتوں میں محرابیں بنانے کا رواج بھی اسی عہد میں شروع ہوا۔ اس دور میں یہ ڈیزائن اتنا پسند کیا گیا کہ لوگوں کے گھروں کے صدر دروازے بھی اسی ڈیزائن کو مد نظر رکھ کر بنائے جاتے تھے۔ آج بھی کی پرانی عمارتوں کے دروازوں کی جھلکیاں اس دور کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ مغل دور کے فن تعمیر اور قیمتی پتھروں کے استعمال اور خاص کر شاہ جہاں کے عہد میں تعمیر ہونے والی عمارتوں کی اہمیت، خوبصورتی اور نفاست کے حوالے سے عبد المجید سالک لکھتے ہیں:

"شاہ جہاں کا شوقِ تعمیر اس کی متعدد عظیم الشان عمارتوں سے ظاہر ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس عہد میں مغل اسلوب تعمیر میں نمایاں انقلاب ہو گیا۔ اکبر کی عمارتوں میں مردانہ اپج اور روز افزوں پائی جاتی ہے اور شاہ جہاں کی عمارتیں نفاست و نزاکت کے اعتبار سے نسائیت کی مظہر معلوم ہوتی ہیں۔ آگرہ کے قلعہ میں شاہ جہاں نے حرم شاہی کی عمارتوں کا جو اضافہ کیا۔ وہ اکبر اور جہانگیر کی بنائی ہوئی عمارتوں کے مقابلے میں نفاست کا پیکر معلوم ہوتی ہیں۔ خصوصا دیوانِ عام اور دیوانِ خاص کی مسلسل محرابیں اور سنگِ مرمر میں قیمتی رنگین پتھروں کی منسبت کاری بے حد دلکش ہے۔ آگرہ کے قلعہ میں ایک انتہائی پاکیزہ عمارت موتی مسجد ہے۔ جو پوری کی پوری سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے اوپر تین قمقہ نما گنبد ہیں جو اس وقت مغل عمارتوں میں عام طور پر مروج ہو چکے تھے"(۴۶)

شاہ جہان کے عہد میں سنگ مرمر سے تعمیر نو کا سلسلہ بہت زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ شاہجہاں کے عہد کے بعد جب یہاں سکھوں کا قبضہ ہوا تو شاہی قلعہ کے اندر رنجیت سنگھ کو شیش محل سب سے زیادہ پسند آیا۔ رنجیت سنگھ نے اس محل پر ایک حرم بھی تعمیر کروا دیا تھا۔ بعد میں تعمیر ہونے والا حرم اور شیش محل بالکل اسی جگہ پر ہے جہاں پر رنجیت سنگھ نے کوہِ نور ہیرے کی نمائش کا پروگرام بنایا تھا۔

یہ عمارتیں مغل دور حکومت کے لاہور شہر کی تہذیب و ثقافت، فن تعمیر کی کاریگری اور ان کی صلاحیتوں کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ لاہور شہر کی اصل ثقافت انہیں عمارتوں کے گرد لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ عمارتیں لاہور شہر کی پہچان ہیں اور ثقافتی ورثہ بھی۔ اس دور کی پرانی تمام عمارتوں کو ثقافتی ورثہ قرار دے کر ان کی تزئین و آرائش کا کام جاری ہے۔

سہ ماہی کائنات کا دفتر:

ڈیوچے بینک روڈ سے آگے حسین چوک کے پاس ایک آبادی والے علاقے میں سہ ماہی کائنات کا دفتر واقع ہے۔ یہ دفتر برس ہابرس سے یہاں پر اپنا کام کر رہا ہے۔ سڑک پر یا دفتر کے باہر سہ ماہی کائنات کے نام کا کوئی بورڈ نہیں لگا ہوا۔ یہاں ایک تین منزلہ عمارت ہے جس کا گراؤنڈ فلور اس دفتر کی تحویل میں ہے۔ جب اس عمارت میں داخل ہوں تو ایک بہت لمبی اور قدرے تاریک ڈیوڑھی ہے۔ اس ڈیوڑھی سے گزر کر تھوڑا آگے جائیں تو نسبتاً ایک روشن کمرہ ہے جس میں ایک میز اور چار کرسیاں بڑے سلیقے سے سجا کر رکھی گئی ہیں۔ سہ ماہی کائنات کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں ہیں:

> "گنگا رام بلڈنگ میں گراؤنڈ فلور پر سب سے معروف جگہ ایک ہی تھی، سہ ماہی کائنات کا دفتر، جہاں ظاہر ہے کہ اس رسالے کا مدیر، جو رسالے سے کہیں زیادہ شہرت اور ہر دل عزیزی رکھتا تھا"(۴۷)

پچھلے کچھ عرصے سے سہ ماہی کائنات مالی مشکلات کا شکار ہے جس کی وجہ سے اس کی اشاعت میں باقاعدگی نہیں رہی۔ پہلے یہ مسلسل اشاعت کرتا تھا اور اس میں نامور ادباء کی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ لاہور شہر کی ادبی خدمات میں لاہور شہر کے نجی ادباء اور شعراء اور کئی دانشوروں کے مقالے اور مضامین اس رسالے میں چھپتے رہے ہیں۔

کاشان پلازہ:

لاہور پلازوں اور مارکیٹوں کے لحاظ سے ایک ترقی یافتہ شہر ہے۔لاہور شہر میں جگہ جگہ مختلف علاقوں میں مارکیٹیں اور پلازے موجود ہیں۔ گو کہ پلازہ کلچر لاہور شہر کی اب پہچان بن گیا ہے لیکن پہلے یہ بھی چھوٹی چھوٹی دکانوں اور مارکیٹوں پر مشتمل تھا۔ جیسے جیسے لاہور شہر ترقی کی جانب گامزن ہو رہا ہے۔ بیس بیس منزلہ عمارتیں آئے دن تعمیر ہو رہی ہیں۔کاشان پلازہ بھی ایک صنعتی اور مارکیٹ کے لحاظ سے لاہور شہر کا اہم مقام ہے۔

مجموعی طور پر اس ناول میں بیان کردہ مقامات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں زیادہ مقامات ایسے ہیں جو کہ تاریخی حوالے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے چونکہ اکثر مقامات قلیل العمر ہیں اور مقامی سطح کے حامل ہیں۔یہ مقامات مقامی اثر ورسوخ کے حامل افراد کے نام پر رکھے گئے ہیں یا بعض کسی خاص سیاسی شخصیت کے نام پر بھی ہیں۔در اصل یہ مقامات لاہور شہر کی پہچان ہیں کہ یہاں کے لوگوں کے مقامی لوگوں سے کس طرح کے تعلقات ہیں۔ یہاں کے باسیوں کی نظر میں ان مقامات کی اہمیت کیا ہے اور لوگ ان مقامات سے کس انداز میں روز مرہ کی زندگی میں جڑے نظر آتے ہیں۔

(ج) دونوں ناولوں میں لاہور کے ماحول کی پیش کش میں اختلافات اور امتیازات:

محمد عاصم بٹ کے دونوں ناولوں میں اگرچہ تکنیک کا بڑا واضح فرق نہیں ہے لیکن ان ناولوں کی کہانیاں کافی حد تک ملتی جلتی ہیں۔ ناول " دائرہ" میں لفظ دائرہ اور تحریر میں دائرہ کی ہی تکنیک مصنف کا پسندیدہ موضوع ہے۔ان کی باقی تحریروں میں بھی یہی تکنیک نظر آتی ہے۔ جبکہ " بھید " کی تکنیک قدرے مختلف ہے۔ عاصم بٹ نے ناول " بھید " کے اندر ایک نئی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس کو بھول بھلیاں سے تشبیہ دی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں کہ عاصم بٹ نے ناول میں کرداروں کے سوا ایک اور بھی بھید ہے جو کہ شہر لاہور ہے اور یہ ایک بھید کی شکل میں ناول میں رہتا ہے۔

دونوں ناولوں میں لاہور شہر کے سٹیج پر مختلف قسم کے کردار آتے ہیں اور اپنا ناٹک کر کے گم ہو جاتے ہیں۔ محمد عاصم بٹ دونوں ناولوں میں لاہور شہر کے ماحول کو پیش کرنے کی کامیاب تکنیک استعمال کی ہے۔ اگر قاری تھوڑی سی توجہ سے ان ناولوں کو پڑھے تو لاہور شہر کے مختلف مقامات کی سیر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ عاصم بٹ نے دونوں ناولوں میں لاہور شہر سے وفا کی ہے اور لاہور کو زندہ وجاوید کر دیا ہے۔اس حوالے سے جمیل احمد عدیل لکھتے ہیں:

> "عاصم بٹ کے ناول بھی کارِ جہاں کی درازی کے تمام سامان سے لیس ہیں۔ ان میں ہمارے گرد و پیش میں بے طرح پھیلی ہوئی زندگی پوری توانائی کے ساتھ دھڑک رہی ہے۔اس جواں سال ناول نگار جس ہنر مندی اور مہارت کے ساتھ اندرون لاہور کی معاشرت کو داستان کا جز بنا دیا ہے، شاید و باید ہی پھر کسی سے اس معجزہ فن کا صدور ہو پائے۔ فی الاصل عاصم نے اپنی عمر کا معتدبہ خاص لاہوری، ٹیکسالی میں بتایا ہے۔ سو اس ماحول کی بڑی گہری تفصیلات اس کے مشاہدے میں شامل رہی ہیں۔ اس کا حافظہ بھی متحیر کر دینے کی حد تک فوٹو گرافک ہے وگرنہ ان تنگ و تاریک گلیوں سے ہزاروں لوگ قرنوں سے گزر رہے ہیں، مگر ایسی منظر نگاری پہ عاصم بٹ جیسا کوئی سچا تخلیق کار ہی قادر ہو سکتا ہے "[۴۸]

دونوں ناولوں میں شروع سے آخر تک لاہور شہر کے ماحول اور یہاں بسنے والی زندگی کو ایک لڑی میں پرو کر بیان کیا گیا ہے۔ جیسے پہلے انار کلی، اردو بازار، لارنس باغ، منٹو پارک وغیرہ جیسے تاریخی مقامات کو لاہوری زندگی سے جوڑ کر واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح دونوں ناولوں کی کہانیاں آگے چلتی جاتی ہیں۔ مصنف اصل لاہوری زندگی کی طرف چلتے نظر آتے ہیں۔ یعنی مصنف کا تمام کرداروں اور مقامات کی طرف جھکاؤ نظر آتا ہے۔ جیسے چاچے دا چھابا، اعظم ٹی سٹال، برٹش کونسل، بسم اللہ جنرل سٹور، کاشان پلازہ وغیرہ۔ یہ سب مقامات لاہور شہر کی جیتی جاگتی اور روزمرہ ضروریات زندگی سے جڑے مقامات ہیں۔

مثلاً چاچے دا چھابا پر روزانہ کی بنیاد پر لوگ صبح سے لے کر شام تک کھانا کھاتے ہیں اور چائے وغیرہ پیتے ہیں۔ روزمرہ کے مسائل پر بات چیت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح کاشان پلازہ لاہوری زندگی کی ناگزیر ضرورت بن رہا ہے اور یہ پلازہ کلچر روزمرہ کے مسائل زندگی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح بسم اللہ جنرل اسٹور زندگی اور ضرورت اشیاء سے جڑا ایک مقامی سطح کا مقام ہے۔ جہاں روزانہ کی بنیاد پر لوگ آتے ہیں اور زندگی کی ضروریات کی چیزیں خریدتے ہیں۔ محمد عاصم بٹ نے جو چیزیں "دائرہ" میں چھوڑی تھیں ان کو بھید میں بیان کر دیا ہے۔ اور اس طرح ایک پورے دائرے کے اندر لاہور شہر کی تہذیب و ثقافت اور کلچر کو سمو دیا ہے۔ اس حوالے سے رفاقت حیات لکھتے ہیں:

> "لیکن عاصم بٹ اپنی دھن کے پکے اور سچے لکھاری ہیں۔ اس لئے ان کی پر خلوص کوشش اور محنت میں کوئی کمی نہیں آتی اور اب ان کا ناول "بھید" سامنے آی تو اسے پڑھ کر لگا کہ اپنی دھن میں سرگرداں ناول نگار کو اس کی مطلوبہ فارم میسر آگئی ہے۔ دائرہ پڑھ کر جو کمی محسوس ہوتی تھی بھید میں انہون نے اس کی پوری تلافی کر دی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ دائرہ سے بھید تک آتے آتے ان کا تخلیقی سفر آگے کی منزلوں کی جانب گامزن ہے اور اسے ان کے فکشن کے لیے نیک شگون قرار دیا جا سکتا ہے"(۴۹)

عاصم بٹ کے ناول "بھید" میں فارم ہی اصل فن ہے جس میں ناول کی زندگی مقید ہے۔ مصتنسر حسین تارڑ صاحب نے اسے بھول بھلیاں سے تشبیہ دی ہے لیکن یہ ایک تاریک اور پر اسرار غلام کی گردش جیسی ہے۔ جس کے اندر بھٹکے ہوئے قاری کی ملاقات انسانی ہیولوں اور سایہ نما انسانوں سے ہوتی ہے۔ ان کے بھیدوں کے

قہقہے اور ان کی تاسف بھری سرگوشیاں ہماری سماعت سے ٹکراتی ہیں۔ ان کرداروں دلچسپ مکالمے قاری کے دل پر دستک دیتے ہیں۔

اگرچہ عاصم بٹ کے ناولوں میں لاہور شہر کے مقامات اور کرداروں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن یہ عاصم بٹ کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے ناولوں میں فن اور زندگی کا شعوری امتزاج واضح نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے اردگرد کی زندگی کو بڑی گہری نظر سے دیکھا اور پرکھا ہے اور پھر تخیل کے آئینے سے گزرنے کے بعد ناولوں کے صفحہ قرطاس پر منعکس کیا ہے۔ ان دونوں ناولوں میں حقیقت نگاری اور مقصدیت اپنی جگہ غالب نظر آتی ہے۔ انہوں نے ان ناولوں میں زندگی کی حقیقت اور اپنے نظریات اور افکار کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کی ہے۔ ناول "دائرہ" اصل میں زندگی کا دائرہ ہے اور یہ لامختتم دائرہ ہے۔ ناول بھید کا بنیادی مقصد بھی دراصل یہ ہے کہ شاید کہانی کے آخر میں اندھیرا ختم ہو جائے۔

دونوں ناولوں کے اندر انسانی بیگانگی اور اس کی لایعنیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "دائرہ" کی یگانگیت تخلیقی کرب سے پھوٹنا شروع ہوتی ہے اور آخر میں جنون کی شکل اختیار کر جاتی ہے جو راشد کو امین گل اور پھر آصف میں تبدیل کر دیتی ہے۔ لیکن اس سارے عمل میں راشد اپنی زندگی کی جدوجہد میں مسلسل ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ اپنی اداکاری کے شوق کی خاطر گاؤں سے لاہور اور پھر آخر فلم انڈسٹری میں اپنے قدم جماتا ہے۔ یہ جدوجہد اس میں حوصلہ پیدا کرتی ہے اور عمل پر اکساتی ہے۔ لیکن وہ اس معاملے کو سمجھ نہیں پاتا اور لایعنیت کا شکار ہو جاتا ہے۔

جبکہ ناول "بھید" میں نوید کی یگانگیت واجنبیت اس کا ذاتی رویہ ہے۔ دوسری جانب دیکھیں تو سماجی اقدار بھی اس کو لایعنیت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ راشد بنیادی طور پر زمین سے جڑا ہوا کردار ہے اور اسے اپنے خوابوں کو عملی شکل دینے کی جستجو ہے اور وہ اس کے لئے کوشاں بھی نظر آتا ہے۔ جبکہ نوید محبت میں ناکامی کے بعد خود کو کم تر محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کا اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے اور وہ زندگی کی جستجو سے عاری ہو جاتا ہے۔

ان دونوں ناولوں کا منظر نامہ لاہور شہر کے مضافات اور شہر کی اندرونی منظر نگاری میں ملتا ہے اور ان میں ایسے کرداروں اور مقامات کی جھلک نظر آتی ہے جہاں زندگی کے جبر مسلسل کو پورے طور پر سہتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔ اس جگہ زندگی کا خصوصی حوالہ نہیں بلکہ عام لوگوں کی اور زندگی سے متعلق کہانی کا اصل تانا بانا ہے۔

اس کیا صل وجہ یہ ہے کہ عاصم بٹ نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ اسی ماحول کے زیرِ اثر گزارا ہے۔ وہ روزنامہ او صاف کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ میری زندگی لاہور میں گزری۔۔۔ لاہور کا اصل کلچر اس کے بارہ دروازوں والے فصیلی شہر میں موجود ہے۔ میری پرورش اسی علاقے میں ہوئی۔۔۔ کوئی بیس بائیس برس کی عمر تک وہاں رہا۔ یہ عمر کا وہ دور ہوتا ہے جب آپ کی شخصیت کی بنیادی ہیئت تشکیل پاتی ہے بہت سے تجربات ہیں۔ منظر ہیں، واقعات ہیں، کردار ہیں جو اس کلچر سے ماخوذ ہیں۔۔۔ میری خواہش ہے کہ اندور شہر کے کلچر کو کم از کم کاغزوں پر محفوظ کر لیا جائے جو سیماب صفت کلچر کی زد میں ہے اور تیزی سے معدوم ہو رہا ہے"(۵۰)

چونکہ وہ اسی شہر کی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دونوں ناولوں میں اپنے ماحول سے چنے ہوئے الفاظ کو بطریق احسن استعمال کرتے ہیں اور کسی بھی منظر کو فوکس کرنے کے واسطے اس کے قریب ترین علاقوں اور تراکیب کا استعمال عمل میں لاتے ہیں۔ پنجاب کے ان دہی علاقوں یا لاہور شہر کے اندرونی علاقوں کے عام سماج سے متعلق زبان ب بھی ان دونوں ناولوں میں ملتی ہے۔ انہوں نے کلاسیکی روایت میں جاری جدیدیت یا فارسیت کے حوالے سے اپنی انگریزی دانی کا سکہ جمانے کی ہر گز کوشش نہیں کی بلکہ وہ الفاظ کی نشست و برخاست اور ناولوں میں جملوں کی دروبست کے اندر پنجابی آہنگ اور تلفظ کو بڑے احسن انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کی مثال ان کے ناول میں یوں ملتی ہے:

"استاد جی۔۔۔۔ کچے ہتھ پاؤ گے تے منہ دی کھاؤ گے تہانوں تے آکھیا سی پیا جی۔۔۔۔ اپنی راہ نہ چھڈو۔۔۔ تسی چنگے سیانے بیانے او، عقل نو ہتھ پاؤ"(۵۱)

عاصم بٹ نے اپنے ناولوں میں اردو کے ساتھ ساتھ جس عمدہ انداز میں پنجابی کے لفظوں اور لہجوں کو برتا ہے وہ صرف انہی کا خاصہ ہے۔ ان کے ناولوں کی پیک کئی مقامات پر بلند ترفع کے ایسے مقامات تک پہنچ جاتے ہیں

کہ وہاں گہرائی کے ساتھ ساتھ متنوع معنی کی حامل نثر میں ڈھل جاتی ہے۔ دونوں ناولوں میں ایسے کئی مقامات ہیں کوئی ایک نہیں بلکہ کئی سطحوں کے حامل محسوس ہوتے ہیں۔

ان کے ناول دائرہ کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں کردارر ایک دم سے ظاہر ہوتا ہے اور پتہ بھی نہیں چلتا کہ اچانک سے غائب ہو جاتا ہے۔ عاصم بٹ کے فن کی اس خوبی کے حوالے سے عامر رانا لکھتے ہیں:

> "عاصم بٹ کے پاس یہ ہنر ہے۔ یہ اپنے ایک کردار کو غائب کر دیتا ہے اور اسی جیسا کردار سامنے لا کھڑا کرتا ہے کہ شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ منظر بدل چکا ہے"(۵۲)

ان ناولوں میں اکثر کردار غیر مطمئن اور عدم تکملیت کا شکار نظر آتے ہیں۔ لیکن کہانی ویسی کی ویسی رواں دواں رہتی ہے ۔ جبکہ بھید میں کردار احساس کمتری کا شکار نہیں نظر آتے ہیں۔ لیکن کچھ کردار حالات کی ٹھوکروں سے تنگ آکر زندگی سے عاری نظر آتے ہیں۔ دونوں ناولوں کے اختلافات اور امتیازات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں ناولوں کی تخلیقی فضا ملتی جلتی ہے لیکن یہ عاصم بٹ کا امتیاز ہے کہ انہوں نے دونوں ناولوں کو لاہور شہر کی زندگی کی حقیقتوں سے جوڑ کر بڑی فنکاری سے اس زندگی کی عکاسی کی ہے۔ عاصم بٹ نے اپنے مشاہدے کی قوت سے ایسے مناظر پیش کیے ہیں جسے تمام انسان آسانی سے دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے کئی مقامات پر جزئیات نگاری سے بھی کام لیا ہے تاکہ قاری کے سامنے مکمل تصویں پیش ہو سکے۔ سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> "منظر نگاری سے باکمال مصنف انہیں ناول کا ایک لازمی جز بنا دیتا ہے اور ان کی مدد سے کرداروں کی فطرت اور سیرت کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اور قدرتی مناظر کی ایسی تصویر تیار کرتا ہے جو افرادِ قصہ کے وقتی جزبات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں"(۵۳)

عاصم بٹ نے اپنے ناولوں "دائرہ" اور "بھید" میں کچھ ایسے مقامات کا تذکرہ بھی کیا ہے جو کہ خالص تاریخی اور تہذیبی پس منظر نہیں رکھتے بلکہ بلکل قلیل العمر رہیں۔ ان مقامات کو مخصوص افراد کی مناسبت سے یا کسی فرد کے انفرادی خدمات یا اس کے خاندان کے اثر ورسوخ کی بنا پر اس سے منسوب کر دیا جاتا ہے یا پھر بعض

اوقات کسی مقام کا نام نامناسب، مشکل یا اجنبی ہوتا ہے۔ گویا ان کو سہل اور مشہور ناموں سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ عاصم بٹ نے کچھ مقامات پر اس طرح کا تذکرہ بعض اوقات صرف ایک سطر میں بھی کیا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عاصم بٹ کا فن یہ ہے کہ ماقبل اور مابعد کے ربط میں اس طرح سے اس مقام کو پیش کرتے ہیں کہ ناول میں اس کی اپنی اہمیت واضح ہو کر سامنے آتی ہے اور وہ مقام اپنی ایک علیحدہ حیثیت اور تشخص رکھتا ہے۔

جس طرح عبدالحلیم شرر نے لکھنوی ثقافت کو پیش کیا ہے اور میر انیس نے کربلا کے موضوع کو خالصتا ہندوستانی پس منظر میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح قرۃ العین حیدر نے بھی ہندوستانی قدیم تہذیب کو نوکِ قلم پر رکھا ہے۔ اسی طرح سے عاصم بٹ نے اپنی زمینی فضا پر رہتے ہوئے لاہور کے ثقافتی اکھاڑے میں پاؤں رکھا ہے اور پھر ایک مضبوط پہلوان کی طرح نبرد آزمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو محمد عاصم بٹ کے دونوں ناولوں میں لاہور شہر کا تذکرہ ایسے ملتا ہے جیسے قدیم متون میں لکھنؤ اور دہلی کا تذکرہ ملتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ صاحب نے ناول کے دیباچے میں بجا کہا ہے کہ محمد عاصم بٹ لاہور شہر کی واڈکا کو اچھی طرح جانتے ہیں اور وہ انہیں جانتی ہے۔ اسی لیے لاہور شہر کے گلی کوچے، باغات، بازار، چوراہے، عمارتیں اور دیگر مختلف شکلوں اور مختلف طریقوں سے بار بار عاصم بٹ کے ناولوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ ان ناولوں میں مختلف کرداروں کی کہانیاں قاری سے اصرار کرتی ہیں کہ یہاں سے لاہور شہر کی اصل تصویر کو دیکھو۔ ان ناولوں میں محمد عاصم بٹ کرداروں کی زندگی کی وسعت اور زندگی کی ہمہ گیری کے ساتھ ساتھ شعور نفس اور احساس کا تنوع بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں کے کردار لاہور شہر کے گلی کوچوں سے باہر نہیں جاتے صرف لاہور میں ہی مقید رہتے ہیں۔ عاصم بٹ نے ان ناولوں کے کرداروں کے سہارے لاہور شہر کے بڑے سے بڑے تاریخی مقامات کے ساتھ چھوٹے سے چھوٹے اور مقامی نوعیت کے مقامات کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۵

۲۔ ایضا، ص ۳۱

۳۔ ایضا، ص ۳۳

۴۔ امر ناتھ، ماسٹر، لاہور کی سیر، انقلاب سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۲۶ء، ص ۶۱

۵۔ کنہیالال کپور، تاریخِ لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۶۷

۶۔ یاسر جواد، لاہور عظمتوں کی کہانی گناہوں کی داستان، آر۔ آر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۵۹

۷۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۳۸

۸۔ امر ناتھ، ماسٹر، لاہور کی سیر، انقلاب سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۲۶ء، ص ۶۱

۹۔ کنہیالال کپور، تاریخِ لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۶۷

۱۰۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۹۰

۱۱۔ ایضا، ص ۹۰

۱۲۔ ایضا، ص ۱۵

۱۳۔ رفاقت حیات، محمد عاصم بٹ کا بھید، غیر مطبوعہ

۱۴۔ اے حمید، لاہور کی باتیں کچھ نئی کچھ پرانی، خورشید مقبول پریس، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۱۷

۱۵۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۴۰

۱۶۔ اے حمید، لاہور کی باتیں کچھ نئی کچھ پرانی، خورشید مقبول پریس، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷

۱۷۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۵۱

۱۸۔ ایضا، ص ۴۷

۱۹۔ سوم آنند، لاہور کی باتیں، مکتبہ جامعہ، نئی دلی، ۱۹۸۱ء، ص، ۲۶۲

۲۰۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۹۰

۱۵۔ حرا فاطمہ، بھید پر ایک نظر، (مضمون)، مطبوعہ، ادارہ عبارت، کراچی، ۲۰۱۹ء، ص ۲

۲۱۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۵

۲۲۔ مستقر حسین تارڑ، پیار کا پہلا شہر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، س ن، ص ۲۴۱

۲۳۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۹۰

۲۴۔ ایضا، ص ۱۲۲

۲۵۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۴۲

۲۶۔ یاسر جواد، لاہور عظمتوں کی کہانی گناہوں کی داستان، آر۔ آر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۷

۲۷۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۴۰

۲۸۔ ایضا، ص ۱۹۴

۲۹۔ بھولا ناتھ وارث، تاریخ شہر لہور، المطبعتہ العربیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۶۳

۳۰۔ امر ناتھ، ماسٹر، لاہور کی سیر، انقلاب سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۲۶ء، ص ۶۵

۳۱۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۱۶

۳۲۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۴۷

۳۳۔ ایضا، ص ۳۵

۳۴۔ محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸، ص ۲۱

۳۵۔ طاہر لاہوری، بلادالاؤلیاءلاہور، علی طاہر اینڈ سنز،لاہور، س ن، ص۱۸۸

۳۶۔ محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۸، ص۴۱

۳۷۔ انور عتیق صدیقی، ہندوستانی تاریخ وثقافت اور فنون لطیفہ، نیشنل میوزیم، نئی دلی، 1993ء، ص۱۰۶

۳۸۔ محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۸، ص۱۰۲

۳۹۔ ایضا، ص۱۱۶

۴۰۔ ایضا، ص۱۰۰

۴۱۔ محمد طفیل، لاہور نمبر، نقوش پریس، لاہور، ۱۹۸۶، ص۷۰۹

۴۲۔ محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۸، ص۱۵۹

۴۳۔ ایضا، ص۱۶۸

۴۴۔ حرا فاطمہ، بھید پر ایک نظر، (مضمون)، مطبوعہ، ادارہ عبارت،۲۰۱۹ء، ص۵

۴۵۔ سر سید احمد خاں آثارالصنادید، مرتبہ خلیق انجم، اردو اکادمی، لاہور، ۱۹۹۰ء ص۱۱۲

۴۶۔ عبدالمجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، س ن، ص۳۷۶

۴۷۔ محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۸، ص۱۷۶

۴۸۔ جمیل احمد عدیل، دائرہ۔۔۔ایک اہم ناول، غیر مطبوعہ

۴۹۔ رفاقت حیات، محمد عاصم بٹ کا بھید، غیر مطبوعہ

۵۰۔ گوہر مقبول، عاصم بٹ کی اوصاف سے گفتگو،، اوصاف، اسلام آباد، س ن

۵۱۔ محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۴ء، ۹۶

۵۲۔ محمد عامر رانا، عاصم بٹ جانتا ہے، مضمون (مطبوعہ)، اردو کالم، اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۱۹ء، ص۱۲

۵۳۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۴۴

باب چہارم:

محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں لاہور شہر کے کردار: تجزیاتی مطالعہ

ناول "دائرہ" میں لاہور شہر کے کرداروں کا تجزیہ:

کسی بھی کامیاب ناول میں کردار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کی باہمی گفتگو اور مختلف معاشرتی رویے مجموعی طور پر مل کر قاری کے ذہن کی تشکیلِ نو کرتے ہیں۔ کرداروں کا جامد اور روایتی ہونا جہاں ایک طرف کسی ادیب کی تحریر کی ناکامی کا سبب بنتا ہے وہاں حرکیات کی روشنی میں یا تصورات الفاظ ایک متحرک اور فعال کردار تحریر کی کامیابی کی ضمانت دیتے ہیں۔ عاصم بٹ اس حوالے سے ایک کامیاب ادیب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ جنہوں نے بہت قلیل مدت میں اپنے قلم کا لوہا منوایا ہے۔ ان کے پیش کردہ کردار اپنے معاشرتی چال چلن اور سماجی ربط کی کڑیوں میں مل کر مکمل سراپا ثقافت اور مجسمہ تہذیب کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

ان کے ناول "دائرہ" اور "بھید" ایسے ناول ہیں جن کو لاہوری ثقافت کا آئینہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص "دائرہ" میں راشد کا کردار خاص اہمیت کا حامل ہے جو کہ بہروپیے کا روپ دھارتے ہوئے مختلف شکلیں بدلتا ہے۔ اپنی ذات کا کتھارسس اور مختلف رکاوٹوں اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے لیے مختلف مراحل میں مختلف جوابی رویوں میں لاہور کا منظر نظر آتا ہے۔ یہاں یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ عاصم بٹ نے اپنا ادبی کیریئر ایک مترجم کی حیثیت سے شروع کیا اور کافکا کے کرداروں اور ان کے اسلوب سے متاثر ہو کر اس کو لاہوری ثقافت میں ڈھال کر پیش کیا۔

"بھید" میں پیش کردہ کردار نوید کی رومانوی زندگی اور پھر محبت میں ناکامی اور پھر ایک ناکام عاشق کی زندگی گزارنا۔ اس بات پر غور کیا جائے تو یہ لاہوری ثقافت کا آئینہ دار ہے کہ ایک عاشق جب اپنی محبت میں ناکام ہو جاتا ہے تو درباروں پر چلا جاتا ہے اور ملنگ بن جاتا ہے۔ اسے دنیا سے کوئی سروکار نہیں رہتا وہ اپنے محبوب کے ہجر میں دنیا چھوڑ دیتا ہے۔ پنجاب کی دھرتی ہیر رانجھا کا خمیر لے کر بالآخر جدید دور کے نوید کو بھی جوگی اور ملنگ بنا دیتی ہے۔

نیاز بیگ:

ہر کہانی کے اندر مختلف قسم کے کردار ہوتے ہیں جو کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں ان کرداروں کو ضمنی کردار کہا جاتا ہے۔ نیاز بیگ کا کردار بھی اسی ضمن میں آتا ہے جو کہ ایک اخبار کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ جیسے ہی کہانی شروع ہوتی ہے نیاز بیگ کا کردار واضح ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ کردار لاہور زندگی کا روایتی کردار ہے جو کہ اپنی زندگی سے خوش بھی ہے اور کچھ حد تک مطمئن بھی نظر آتا ہے۔ دفتر کے اندر کچھ ملازمین اس کے ماتحت کام کرتے ہیں جن کے ساتھ اس کا رویہ کافی حد تک حوصلہ افزا ہے۔

نیاز بیگ یہاں کام کرنے سے پہلے کچھ عرصہ فوج میں بھی رہ چکا ہے اس لئے اس کا مزاج سخت ہے لیکن پھر بھی وہ اپنی زندگی میں تمام تر مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے بھرپور تعاون سے زندگی گزارتا ہے۔ دراصل اگر ہم دیکھیں تو لاہور جیسے بڑے شہر کے اندر بہت سارے کردار ہمیں نظر آتے ہیں جو اپنی ثقافت کو ہی نہیں بھولے اور زندگی میں جو بھی دشواری ہو ان کا سامنا کرتے ہیں۔

نیاز بیگ بھی لاہوری ثقافت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لاہوری پنجابی اس کی زبان کی شان ہے جو کہ لاہوری ہونے کا حق ادا کرتی ہے۔ جیسا کہ عاصم بٹ نے اپنے ناول میں نیاز بیگ کی صورت گری کی ہے جو لاہوری پنجابی اور ثقافت کو ہمارے سامنے بیان کرتی ہے وہ لکھتے ہیں:

> "گھڑی نے پانچ بار گھنٹہ بجایا تو اس کا آخری دفتری رفیق نیاز بیگ بھی کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا جو پچھلے قریب آدھے گھنٹے کے دوران صبح کے اخبارات کو تیسری یا چوتھی مرتبہ بغور پڑھ چکا تھا۔ اپنے معمول کے مطابق وہ اب کھڑا خاموشی سے اپنی خالی کرسی کو تکتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا جیسے وہ کچھ بول رہا ہو اور یاد نہ کر پا رہا ہو کہ وہ کیا بات تھی۔ دروازے کے برابر سٹول پر بیٹھے زمان خان نے با آواز بلند جمائی لیتے ہوئے کہا" بیگ صاحب۔ کیا سوچتی ہے ؟ نیاز بیگ اپنے خیالات سے چونکا۔ گردن پھیر کر زمان خان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے وہی متفکر انداز میں بولا" سوچ رہیاں ہاں خان صاحب۔ ایس ملک دا کی

بنڑیں گا میرے بعد"۔ "اتنا مت سوچا کرو بیگ صاحب۔ پہلے ہی اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔" زمان خان نے قدرے بیزاری سے کہا۔"(۱)

مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح سے عاصم بٹ نے لاہور شہر کے کرداروں کے ذریعے ہمارے سامنے لاہور شہر کو پینٹ کیا ہے۔ قاری ان کرداروں کے مکالمے سے لاہور شہر کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن، یہاں تک کہ ان کی سوچ کے مظاہر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

نیاز بیگ کا کردار اگرچہ بہت چھوٹا کردار ہے لیکن اس کے باوجود ایک مضبوط کردار ہے اور کام سے مخلص نظر آتا ہے۔ اس کردار سے لاہوری کلچر کہ ایک اور بہت اہم بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ لاہوری کلچر میں لوگ سینئیر جونیئر صرف کام کی حد تک ہوتے ہیں اور عزت و احترام اپنی جگہ ضرور ہے لیکن ایک دوسرے سے ہنسی مزاق کرنا، کسی کو بھی کم تر نہ سمجھنا اگرچہ اس کا عہدہ چھوٹا ہو، اس سے کھل کر بات کرنا اور آپس میں گھل مل کر رہنا لاہوری کلچر کی خاصیت ہے۔

زمان خان :

عاصم بٹ نے اپنے ناول میں لاہوری زندگی اور اس سے جڑی تہذیب و ثقافت کو بیان کرنے کے لیے اپنے ناول میں کرداروں کی بھرمار کی ہے اگرچہ کچھ کردار بہت کم وقت کے لئے کہانی میں آتے ہیں لیکن وہ کردار بھی لاہوری زندگی کا کوئی نہ کوئی بہت اہم پہلو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کردار زمان خان کا ہے جو کہ ایک دفتر میں چوکیدار کی نوکری کرتا ہے اور اس سے پہلے وہ "نور فارورڈنگ کمپنی" میں ٹرک ڈرائیور تھا۔

اس کردار کی کہانی ہمارے معاشرے کے ایک بہت ہی بوسیدہ اور شرمناک پہلو کی عکاس ہے۔ عاصم بٹ نے بڑی چابک دستی سے اور بلا جھجک ہمارے سامنے زمسان خان کے کردار کے پس پردہ لاہوری زندگی میں عیاشی اور طوائف کلچر کو پینٹ کیا ہے۔ ایک ٹرک ڈرائیور کے اندر جتنی بھی برائیاں پائی جاتی ہیں ان سب برائیوں کو زمان خان کے اندر دکھایا گیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک ٹرک ڈرائیور تھا اور اسے چرس پینے کی عادت تھی جس وجہ سے اسے ٹرک کمپنی سے نکالا گیا اور وہ اپنے آبائی گاؤں گیا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد وہاں سے لاہور آ گیا۔

دن میں یہاں کام کرنے لگا اور رات کو جمال شاہ کے مزار پر جا کر سوتا اور جو پیسے کماتا ہے اسے چرس میں اڑا دیتا۔ اس طرح اس کی زندگی طوائفوں کے محلے سے جڑ گئی اور اس کی ملاقات زیتون بانو نامی طوائف سے ہوئی جو ایک کوٹھے پر دھندا کرتی تھی۔ جب پہلی بار زمان خان اس کے پاس گیا ایک ٹائم کے پیسے دیے لیکن وہ پہلی بار میں ہی اسے بھا گئی اور پھر وہ وقفے وقفے سے اس کے پاس جانے لگا پر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ ساری رات کے لئے اسے خرید لیتا اور اس کے ساتھ وقت گزارتا۔ ایک رات اس نے اسے کہا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن زیتون نے کوئی جواب نہیں دیا اور پھر وہ کبھی بھی وہاں نہ گیا اور اپنے رشتہ داروں میں شادی کی اور چوکیدار کی نوکری کرلی۔

دراصل یہ کردار ہمارے سامنے ایسے معاشرے کی تصویر کشی کرتا ہے جو منٹو نے دکھایا تھا ہمارے معاشرے کی غلاظت کو عاصم بٹ نے اس کردار کے ذریعے اس تصویر کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری تمام مناظر گویا اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو اور حیا کا پردہ بھی حائل ہو۔ زمان خان کا کردار لاہوری معاشرے کے عام کردار سے ذرا ہٹ کر ہے اس نے زیتون سے محبت کی لیکن اسے نبھانے کی جرات نہ کر سکا۔ اگر وہ اسے نبھانے کی جرات کرتا تو ایک طوائف کی اس غلاظت بھری زندگی سے جان چھوٹ جاتی۔ دراصل یہی ہمارے معاشرے کا وہ پہلو ہے جسے سب لوگ جانتے تو ہیں لیکن اس پر قلم اٹھانے کی جسارت کوئی بھی نہیں کرتا لیکن عاصم بٹ نے بڑی عمدہ کاریگری سے بیان کیا ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

> "اوروں کے لیے نہ سہی زمان خان کے لیے البتہ وہ پہلی عورت تھی۔ پہلی بار تو ایک ٹائم کے لئے اس کے پاس ٹھہرا۔ لیکن اس ایک بار سے جیسے اس کی تشنگی اور بڑھ گئی۔ پھر وقفے وقفے سے آنے لگا۔ جب بھی آتا ہے ڈیرے دارنی کو رات بھر کے ٹائم کے پیسے دیتا۔ زیتون بانو اس رات وہیں ٹھہرتی۔"(۲)

اس اقتباس سے قاری لاہوری کلچر کی ایسی تصویر دیکھتا ہے جو ایک اسلامی ملک میں رہنے والے کی آنکھوں کو جھکا دیتی ہے۔ زمان خان کا کردار غیر مطمئن کردار رہا ہے اگرچہ اس نے عیاشی میں زندگی گزاری لیکن

اس کے باوجود اسے ایک پچھتاوا رہتا ہے کہ اسے زیتون بانو کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا وہ ضرور اس کا انتظار کرتی ہو گی۔

زیتون بانو:

عاصم بٹ کے ناولوں کے اندر رومانس کا تڑکا ضرور پایا جاتا ہے اور ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ فطری تقاضہ بھی ہے اور اسی تقاضے کے تحت ناول "دائرہ" میں ایک کردار ہے جو کہ لاہور شہر کی زندگی کو بیان کرتا ہے جس کا نام زیتون بانو ہے۔

زیتون بانو کا کردار کہانی میں تھوڑی دیر کے لئے رونما ہوتا ہے اور دیرپا اثر چھوڑ کے جاتا ہے۔ قاری اس کردار کو کبھی بھول نہیں پاتا۔ زیتون بانو ایک عام سی، مسکین اور بدکار عورت ہے جو ایک رومانوی اور سسپنس سے بھرپور ناول کی مرکزی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ زیتون بانو دھندا کرنے والی ہر دوسری عورت کی طرح اس کی زندگی بھی اس معاشرے کی روزمرہ کی سفاک یکسانیت اور استحصال کے بوجھ تلے روندی ہوئی۔

اس کی مجبوری اور لاچاری شام کے وقت اسے اس دھندے پر کھینچ لاتی ہے۔ دوسری طرف دلال ڈھائی سے تین سو روپے میں گاہک گھیر کر لے آتا۔ یہاں لانے سے پہلے ہی وہ اپنے حصے کے تیس چالیس روپے رکھ لیتا۔ تیس روپے فی گاہک سنتری کی جیب میں جاتے اور اتنے ہی اس علاقے کے ٹھیکیدار کی جیب کی نظر ہو جاتے۔ زیتون بانو کے ہاتھ صرف ساٹھ سے ستر روپے لگتے۔ مندے کے دنوں میں بھی سین سے چار سو کی دہاڑی لگ جاتی تھی۔ ہاں اگر کبھی کوئی میلا یا عرس وگیرہ ہوتا تو اس کی خوب کمائی ہو جاتی۔ جو بھی ہو زمان خان کے لیے وہ پہلی عورت تھی۔ زیتون بانو کا کردار ایک ایسے طبقے کی نمائندگی کرتی جو اپنی مجبوریوں کے ہاتھوں اس معاشرے کے تسلط کا نشانہ بن جاتا ہے۔

زیتون بانو کی ایک بیٹی تھی اس کا پیٹ پالنے کی خاطر وہ اس کام پر مجبور ہو گئی۔ اگرچہ زمان خان کے لیے وہ پہلی عورت تھی اور اس میں تجسس بھی تھا لیکن وہ اس کا ہاتھ تھامنے کی ہمت نہ کر سکا۔ زیتون بانو نے ضرور اس کی

راہ دیکھی لیکن تھک ہار کر اس نے یہ امید بھی چھوڑ دی۔ یہ اس لیے نہیں کہ وہ زمان خان کو اپنا مان چکی تھی بلکہ اس لیے کہ اسے پیار بھرے دو بول سننے کو ملتے ہیں۔ یہ باتیں اس سے پہلے بھی کئی بار کہی جا چکی تھیں لیکن زمان خان اس کی دل جوئی کرتا، اس کی جوانی کی تعریف کرتا اور ایسی پیار بھری بہت ساری باتیں جو اس کے دل کو گہرا سکوں بخشتیں۔

لاہور شہر کی ہیرا منڈی ایسے بے شمار کرداروں سے بھری پڑی ہے۔ ایسے کردار ہمارے معاشرے کے ٹھیکیداروں کے منہ پر طمانچہ ہیں۔ بہر حال لاہور شہر کی تنگ و تاریک گلیوں کو عاصم بٹ نے ایسے کرداروں کے ذریعے زندہ جاوید بنا دیا ہے اور قاری کے سامنے لاہور شہر کے سارے رخ پیش کر دیئے ہیں۔ اسی حوالے سے وہ اپنے ناول "دائرہ" میں زیتون بانو کی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

> "ایسی ہی ایک رات ۔۔۔وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا، " مجھ سے شادی کرو گی؟" عورت ناک کی سیدھ میں چھت کو تکی جا رہی تھی۔ اور پلکیں جھپکے بنا اسے سنا کی اور چپ رہی، جیسے کچھ بھی نہ سن پائی ہو یا چاہتی ہو کہ وہ پھر سے یہی بات کہے۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا۔ کوٹھڑی سے نکل کر وہ اندرونی کمروں کی طرف چلی گئی جہاں اس کی بیٹی سو رہی تھی اور زمان خان باہر سیڑھیوں کی طرف ہو لیا"[۳]

زیتون بانو کا کردار لاہور شہر کے اس معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جو جنسی استحصال کا شکار ہے۔ ان طوائفوں کی کئی مجبوریاں ہیں جو انہیں اس دلدل میں دھکیل دیتی ہیں اور یہ ایک ایسا جال ہے جس سے وہ چاہتے ہوئے بھی نکل نہیں پاتے۔

آصف / راشد:

محمد عاصم بٹ کا ناول "دائرہ" فکری اعتبار سے بہت دل چسپ ناول ہے۔ اس ناول میں کرداروں کے مکالمات، ان کی داخلی خود کلامی کے خیالات اور ان کی ذاتی زندگی کے المیہ و حزنیہ زندگیوں کے واقعات اس طرح دلچسپ انداز میں بیان کئے گئے ہیں کہ ناول کا ایک ایک لفظ قارئین کے لیے مفاہیم کے نئے دروازے کھولتا ہے۔

خاص طور پر اس ناول کا سب سے اہم اور مرکزی کردار راشد اور اسی کا دوسرا رخ آصف مراد کا کردار ہے۔ اس طرح دونوں کردار مل جاتے ہیں کہ ان کی تفریق مشکل ہو جاتی ہے۔ ایک طرف راشد فلمی اداکار ہے اور اپنے کام کے ساتھ اتنا مخلص ہے کہ ناول کی قرات کے دوران میں قاری حقیقی اور فلمی زندگی کے مناظر میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ جس طرح نیلے رنگ کے کپڑے بدل کر کوئی ہرے رنگ کے پہن لے بالکل اسی طرح راشد نے خود پر سے راشد کو اتار کر آصف مراد کو پہن لیا ہے۔

جیسے کوئی گہری بات ہو یا کوئی لا ینحل معمہ ہو جیسے ہم سوچ لیتے ہیں کہ شاید راشد اپنے ماضی سے زیادہ شر مسار تھا۔ اس لئے اس کا بچپن انتہائی نچلے درجے میں گزرا تھا۔ وہ اس شدید غربت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی غلاظت اور آلائش بھری زندگی جی چکا تھا اس کے تکلیف اور بے چارگی و بسے بسی کے مارے ہوئے ماضی نے اس کے لاشعور کو جکڑ کر رکھا ہوا تھا۔

دوسری طرف آصف مراد ایک مڈل کلاس روایتی گھر میں پلا ہوا کردار جس کا اچھا ماضی راشد کو زیادہ محفوظ اور آسودہ حال نظر آتا ہے۔ چنانچہ راشد نے اپنی زندگی کو رد کر کے اپنی داستان کو بدل لیا اور آصف مراد بن گیا یا۔ آخر کار اسی طرح یہ کہانی راشد کی ہے جو زندگی کا راستہ بھول گیا ہے وہ راشد ہے، آصف مراد ہے یا کون ہے۔ یہ کردار ایک لا انتہا دائرے میں گول گول گھومنے لگتا ہے اس حوالے سے روبینہ سلطان لکھتی ہیں:

> "آصف مراد دراصل اس فلم "دائرہ" کا ایک کردار ہے جس کا اصل نام راشد ہے۔ یہ ناول کی ایک پرت ہے جس کو راوی قوتِ ترغیب سے لیس کر کے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے لیکن یہ قوتِ ترغیب اب یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس کے بعد کہانی کی اگلی پرت شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں آصف مراد خود کو راشد ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور مسلسل یہ کہتا ہے آصف مراد ہے راشد نہیں ہے۔ یہاں پر راوی ایک اور نکتہ بیان کرتا ہے جو بڑا الجھا ہوا ہے اور ساتھ ساتھ قاری کو بھی الجھاتا ہے۔ یعنی اگر آصف مراد راشد ہے تو آصف مراد کون ہے اور اگر آصف مراد ہے تو راشد کون ہے۔۔۔ پھر اپنی شخصی پہچان کا المیہ پوری کہانی میں چلتا ہے"(۴)

ناول "دائرہ" میں فکر کے منفرد اور انوکھے مظہر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس ناول کے موضوع میں گہرائی ہے جو قاری کے لئے غور و فکر کو ہوا دیتی ہے۔ انسان دورِ جدید میں شناخت کے جس بحران کا شکار ہے اس کا عملی اظہار ناول میں نظر آتا ہے۔ شناخت کی پہچان اس کردار کا بنیادی موضوع ہے اور یہ کردار اداکار ہے جو فلم میں آصف مراد کا کردار اوڑھ لیتا ہے۔ اس فلمی ایکٹر کے سارے پہلو راشد کے اعصاب پر سوار ہو جاتے ہیں اور وہ نفسیاتی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ زندگی کا عذاب اس کے لیے دائر کی طرح لا مختتم بن جاتا ہے۔ اس کے دار کی کہانی کا آغاز حال سے ہوتا ہے اور پھر ایک لمبے عرصے کے لیے ماضی کا بیان بن جاتا ہے اور اسی طرح سے باقی کرداروں کو بھی پہلے حال میں دکھایا گیا ہے اور بعد میں ماضی میں۔ اور اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> "جس گھر میں راشد پیدا ہوا وہ بستی کے دوسرے گھروں کی مانند ہی ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل تھا۔ صحن کی دیواریں اتنی پست تھیں کہ باہر گلی میں چلتے ہوئے آسانی سے اندر سب کچھ دکھائی دیتا۔ گو اندر دیکھنے کے لائق کوئی ایسی خاص چیز نہیں تھی سوائے نیم کے ہرے بھرے پیڑ کے جس کے موٹے تنے کو کٹوانے اور بیچنے کی جبر و سائیں نے متعدد بار کوشش کی لیکن ہمیشہ اس کی بیوی نسیم سینا تان کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی"(۵)

دراصل یہ مصنف کا کمال ہے کہ اس نے ایک شخص کے دو چہروں کو بے نقاب کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ہر شخص مختلف چہروں کے نقاب لگائے پھرتا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے اسی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ محمد عاصم بٹ کے ناول "دائرہ" میں لاہور کی تہذیب و ثقافت، اندرون شہر کی زندگی اور اس زندگی سے جڑے مختلف کرداروں کو دکھایا ہے۔ لہذا ہمیں کہانی میں وہی لہجہ نظر آتا ہے اس حوالے سے صدف نقوی اپنے مضمون "محمد عاصم بٹ کی ناول نگاری" میں یوں رقمطراز ہیں:

> "محمد عاصم بٹ نے اس ناول میں لاہور کی تہذیب، اندرون شہر کی تنگ و تاریک فضا، محبت کے دعویداروں کی مکاریاں اور عیاریاں اور معصوم لڑکیوں کے بہکاوے میں آنے کے موضوعات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ مصنف نے اس ناول میں متوسط طبقے کی

زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ دراصل یہ طبقہ ہماری طبقاتی تقسیم میں نہایت اہمیت کا حامل ہے اور دوہری زندگی کے عذاب کا شکار ہے"(۶)

اسی حوالے سے غفور احمد ایک جگہ لکھتے ہیں:

"دوہری زندگی کا عذاب دائرے کی طرح لا مختتم ہے۔ دائرے کا ہر کردار اپنے حصے کی گولائی میں اس طرح اضافہ کر جاتا ہے کہ اسے اپنی ابتدا کی خبر ہوتی اور نہ انتہا کی۔ اس ناول کا موضوع ہر انسان کی زندگی کا موضوع ہے"(۷)

آصف مراد کا کردار اس ناول میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے مگر کہانی کا ماس اس پر نہیں منڈھا گیا۔ وہ باقی کرداروں اور حالات سے اس حد تک دب جاتا ہے کہ اپنی نمائندہ شناخت بھول جاتا ہے اور ایک ذیلی کردار میں ڈھل جاتا ہے۔

راشد ہی کے کردار کے ذریعے قاری کو اندرون شہر لاہور کی گلیوں میں جانے کا موقع ملتا ہے۔ وہاں پر بچپن اور ٹین ایج لڑکوں کے اطوارِ زیست کو بہت عمدہ مدارج اور جزئیات نگاری سے بیان کیا گیا ہے۔ ان گلیوں کے پاس ہیرا منڈی اور بازارِ حسن کے ہونے کی وجہ سے وہاں جانے کا ایک تجسس اور خواہش ان ٹین ایج لڑکوں کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ نہ صرف اس خواہش اور تجسس کو بیان کرتے ہوئے مصنف سب کرداروں کی عکاسی کا صحیح حق ادا کرتا ہے بلکہ ان کرداروں سے جڑی تمام باتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس حوالے سے رابعہ الربا اپنے مضمون "دائرہ" میں یوں لکھتی ہیں:

"حالات کی مہربانی کے ہاتھوں یہ کردار اپنے شوق کی منزل کو تو پا لیتا ہے مگر رہتا الجھا ہوا ہی ہے۔ خود کو حال کے دائرے میں قید کیے ہوئے ہے۔ اس لیے ناول کے آغاز میں ہی ایک تجسس جنم لے لیتا ہے۔ ایک ابنارمل سا کردار معلوم ہوتا ہے مگر چونکہ وہ ایک فلمی کردار میں ڈھلا ہوا ہے اس لیے قاری کو پڑھنے پر مجبور کرتا ہے"(۸)

راشد ایک کامیاب کردار ہونے کے باوجود مضبوط کردار نہیں ہے۔نہ صرف خود معاشرے کا عکاس ہے بلکہ اسی حوالے سے ناول میں سماج کی نمائندگیکرتا نظر آتا ہے اور یہی سماج مصنف کا مشاہدہ اور تحقیق میں لطف پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً جب وہ امتیاز علی خان کی سرپرستی میں جاتا ہے تو اس کردار کے توسط سے موسیقی راگوں ،راگنیوں اور سروں کی ایک سات صفحات پر مشتمل تفصیلی جزئیات نگاری موجود ہے۔

مٹھو کباڑیہ:

محمد عاصم بٹ کا ناول "دائرہ" حقیقی زندگی کے سبھی ذائقوں سے مزین نظر آتا ہے جو کہ ہر منظر اور ہر جزو کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایسے کردار چن کر لاتا ہے جو ہماری زندگی میں غیر اہم ہوتے ہیں لیکن اس ناول میں بھرپور وسعت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

ایسا ہی ایک کردار مٹھو کباڑیے کا ہے جس پر عام لکھاری کی نظر نہیں جاتی لیکن عاصم بٹ نے ایسی کمال صورت گری کی ہے مٹھو کباڑیے کے ایک ایک پہلو اور حرکت کو ایسے پیش کیا ہے جیسے زندہ مٹھو کباڑیہ قاری کے سامنے بیٹھا ہو۔ مصنف نے گویا اس کردار کے ہر رنگ اور خوشبو کو کشید کر کے اپنے ناول کے صفحات میں جگہ دے دی ہے۔ مٹھو کباڑیا کی دکان کا ایسا نقشہ کھینچا ہے قاری داد دیئے بنارہ نہیں پاتا۔

یہ کردار ایک ایسے پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو استحصال کا شکار تو ضرور ہے لیکن اپنے زندہ دل ہونے اور لاہوری ہونے کا ثبوت دینے کے لیے دن رات محنت کر کے اپنا پیٹ پال رہا ہے۔ اسی طرح عاصم بٹ کے اکثر کردار متوسط طبقے کے کردار ہیں اور لاہور کی تہذیبی زندگی کا مرقع بھی ہیں۔ عاصم بٹ نے ایک معمولی کباڑیے کے کردار کا سہارا لے کر لاہور شہر کی زندگی کی جن قدوں کو پیش کیا ہے اس میں ہمارے گردوپیش میں بے طرح پھلی ہوئی زندگی اپنی پوری اب وتاب سے دھڑک رہی ہے۔ مصنف نے جس ہنرمندی اور مہارت سے اندرون لاہور کی معاشرت کو داستان کا جز بنادیا ہے۔ ایسی منظر نگاری پر عاصم بٹ جیسا سچا تخلیق کار ہیں قادر ہو سکتا ہے۔ جس طرح مٹھو کباڑیے کے کردار کے حوالے سے وہ ناول میں لکھتے ہیں:

"جب کوئی بچہ سہ جب کوئی بچہ پچیس پیسے کا سکہ اسے تھماتا تو وہ حوض کا ڈکن اٹھاتا۔ اندر صاف شفاف پانی بھرا ہوتا اور اس میں بے شمار ننھی منی مچھلیاں تیرتی دکھائی دیتیں۔ وہ دکان میں ایک طرف ہاتھ بڑھا کر پلاسٹک کا سفید لفافہ اٹھاتا۔ اس کے دہانے کو بائیں ہاتھ سے دونوں طرف کے کناروں سے پکڑتا۔ پھر حوض میں ڈبو کر اس میں پانی بھرتا۔ کھڑکی سے باہر کھڑے بچے اس سارے عمل کو گہرے اشتیاق اور تجسس کے ساتھ دیکھتے۔ لفافہ باہر نکال کر وہ داہنا ہاتھ حوض میں ڈالتا اور لفافے کے منہ کے اوپر لا کر مٹھی کھول دیتا۔ ایک ننھی سے مچھلی اس کی مٹھی سے لفافے کے اندر پانی میں ٹپک پڑتی اور ادھر ادھر تیرنے لگتی۔ وہ لفافے کے منہ کو دھاگے سے بند کرتا اور اسے بچے کو تھما دیتا"(۹)

دنیا کے ہر خطے میں بچوں کی دل چسپی اور تفریح کے مختلف لوازمات موجود ہیں لیکن مصنف نے اس پیراگراف میں لاہوری بچوں کے تفریحی پہلو کو ظاہر کیا ہے کہ ننھے منے بچے چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور مٹھو کباڑیہ بچے کی اس ضرورت سے کاروبار حیات چلاتا ہے۔ اس کی دکان پر بچے خریداری کے لیے آتے ہیں اور اس منظر سے لطف اٹھاتے ہیں جو ان کو مٹھو کباڑیا کی دکان پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک طرف مٹھو کباڑیہ اور دوسری طرف بچوں کا ہجوم اور تیسرا مچھلیوں کا تماشا اور چوتھا پہلو مٹھو کباڑیے کی پیشہ ورانہ پختگی اور اپنے فن میں مہارت۔ یہ تمام عناصر مل کر ایک مکمل وحدت کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور لاہوری معاشرت میں ضم ہو جاتے ہیں۔

نورین:

نورین کا کردار اس ناول میں ایک معصوم اور مظلوم لڑکی کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ ایک بہترین ہیروئن کا کردار بھی ہے۔ محمد عاصم بٹ کے ناول "دائرہ" میں عورت کے جتنے بھی کردار ہیں وہ تمام خاص توجہ کے حامل ہیں۔ نورین کی طرح امتیاز علی خان کی بیوی اور نورین کی والدہ بھی مرد کے استحصال کا شکار رہتی ہے۔ اس ناول میں عورت کے حوالے سے مردانہ رویے پر روشنی ڈالتے ہوئے یاسر جواد رقمطراز ہیں:

"عاصم کی عورت سراسر داخلیت اور مرد قطعی ماورائیت ہے۔ یہ ماورائیت اسے بار بار لایعنیت سے دوچار کرتی ہے۔ بار بار اپنا مفہوم ڈھونڈنے کی خاطر عورت میں غوطہ لگاتا ہے اور نیا ہو کر باہر نکلتا ہے۔ ہوٹل کا چاچا، امتیاز علی خان اور نوید اسی قسم کے کردار ہیں۔ مصنف کو مرد بطور پہنتے اور بیویوں کو دکھ کی موت مارتے ہیں۔ یہ رویہ ایک مردانہ اور شاہانہ جلال کی جانب اشارہ کرتا ہے"(۱۰)

"دائرہ" میں نورین کا کردار متنوع قسم کا کردار ہے۔ ایک طرف وہ نوید سے محبت کرتی ہے اور اس کی ہوس کا شکار ہو کر دلبر داشتہ ہو جاتی ہے اور دوسری طرف آصف مراد اس کی زندگی میں آتا ہے جو اس کے لیے زندگی بھر کا سہارا بن جاتا ہے اور وہ اپنی دنیا اسی کے گرد بننے لگتی ہے۔ نورین کے کردار کے گرد اندورن لاہور کی نسائی جھلک کے نئے ادوار کھل کر قاری کے سامنے آتے ہیں۔ میل سوسائٹی میں ایک عورت پر ہونے والے مظالم، ایک بیٹی اور بہن اور پھر ایک سماج میں رہنے والی ایک عورت کی وجہ سے جو بھی برتاؤ اس کے ساتھ زندگی کے مختلف ادوار میں ہوتا ہے ان تمام تر مناظر سے پردہ اٹھانے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔

نورین ایک مضبوط کردار نہیں ہے بلکہ کہانی میں موجود کچھ اور کردار اسے شعوری اور لاشعوری طور پر کامیاب بناتے ہیں۔ نورین کے باپ نے بیٹے کی خواہش میں دوسری شادی کر لی اور پہلے والی بیوی سے برا سلوک کرتے ہوئے الگ ہو گیا۔ جب بیٹے بڑے ہوئے تو بڑا بیٹا میٹرک کے بعد لاہور آ گیا اور یہاں آ کر باقی تعلیم یونیورسٹی میں مکمل کی اور یونیورسٹی کی ہی ایک لڑکی سے شادی کر لی اور کبھی پلٹ کر گاؤں نہ گیا۔ باقی دونوں بیٹوں نے بھی اوباش زمینداروں والی حرکات اپنائیں اور انہیں حرکات کی وجہ سے اللہ داد نے ان کی جلد شادی کرا دی۔

نورین کی والدہ نے اس کو پڑھانے کی ٹھان لی اور اسے لاہور اپنی بڑی بیٹی کے پاس بھیج دیا اور یہاں آ کر پڑھنے لگیں اور محلے کے ہی ایک لڑکے سے اس کا معاشقہ ہو گیا جو اس کا ماہر تھا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور اس نے نورین کی معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور اپنا راستہ بدل لیا۔ اس دھوکے باز عاشق نے نورین کو ایسی چوٹ لگائی کہ وہ پلٹ کر اس کی طرف نہ جا سکی اور کچھ عرصے بعد اس نے اپنی تعلیم کو جاری رکھا اور وہاں اس کی ملاقات راشد سے ہوئی اور دونوں نے شادی کے بندھن میں بندھ کر زندگی کا آغاز کیا۔

نورین اگرچہ ایک کامیاب فلمی اداکارہ ہے لیکن اس سے زیادہ وہ اپنے معاشرے کی عکاس ہے عورت بن کر سامنے آتی ہے جو کہ شوہر پرست دیوی ہے۔ شوہر کی وفادار اور بے پناہ محبت کرنے والی عورت بن کر ابھرتی ہے۔ ایسا لازوال کردار "دائرہ" کے اندر کوئی دوسرا ڈھونڈ پانا اپنا بہت مشکل ہے۔ وہ کم از کم ایک بیوی بننے کے بعد تراشا ہوا اور منجھا ہوا کردار لگتی ہے۔ ماضی کی مجبوریوں کے ہاتھوں خوفزدہ عورت ہے جس کو اس کا ماضی ایک سانپ کی طرح لاشعوری طور پر ڈستا ہے۔ نورین کا کردار کہیں کہیں تخیلاتی ذہن کی اختراع معلوم ہوتا ہے لیکن جب تک وہ بیوی نہیں بنتی تب تک اس کا کردار حقیقی معاشرے کا عکاس نظر آتا ہے۔ اس کے اندر کسی بھی جگہ مزاحمتی رویہ نظر نہیں آتا اور پر سکون لگتی ہے۔

نورین کا کردار ہمارے معاشرے کے اس رخ کا عکاس ہے جہاں عورت کو ایک مشین کے علاوہ کچھ نہیں سمجھا جاتا۔ جب ایک عورت دھوکا کھا لیتی ہے تو پھر کسی پر اعتبار کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ عورت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ وہ معاشرے سے دب کر رہتی ہے اور کسی بھی قسم کی مزاحمت کرنے کے لیے اسے بہت ہمت اور جدو جہد کی ضرورت پڑتی ہے۔ عاصم بٹ نے اسی بات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستانی معاشرے کی عورت کس استحصال کا شکار نظر آتی ہے۔

حمید اختر:

محمد عاصم بٹ کے ناول "دائرہ" کی کہانی کیوں کہ فلمی دنیا کی کہانی ہے اس لیے اس میں بہت سارے کردار دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تمام کردار اپنی اپنی زندگی میں مگن نظر آتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کردار حمید اختر کا ہے جو کہ فلم انڈسٹری میں کافی جان پہچان کا حامل ہے لیکن نفسیاتی طور پر یہ کردار احساسِ کمتری کا شکار نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کو فلم انڈسٹری کے لوگ جانتے ہیں اور اس کو ابھی تک فلم انڈسٹری کے چکر ہی لگوائے جاتے ہیں۔ حمید اختر ایسا مستقل مزاج آدمی ہے کہ چانس نہ ملنے کی وجہ سے کبھی دلبرداشتہ نہیں ہوا۔

ہر نئی فلم شروع ہونے پر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر سے ملنا کہ شاید اسے کبھی کوئی کردار مل جائے لیکن بے سود۔ فلم انڈسٹری میں ایسے بہت سارے کردار پائے جاتے ہیں جو ایک طرح کے حسد پن شکار ہوتے ہیں اور ہر

ایکٹر سے حسد کرنا ان کی فطرت میں شامل ہو جاتا ہے۔ حمید اختر بھی تھوڑا سنکی قسم کا کرسار ہے جو لوگوں کی باتوں کو نوٹ کرت ہے اور ان کا نوٹس لیے بغیر ہی ردِ عمل دینا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

کوئی بھی ایکٹر ذرا سی بات کر لے اس کے پیچھے پڑ جانا اور آخر اسے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ حمید اختر کا کردار زندگی سے غیر مطمئن نظر آتا ہے لیکن دوسری طرف ہمت اور اپنے ارادوں میں بہت حد تک پختہ بھی ہے۔ اسے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل اس کا بھی وقت ضرور آئے گا اور وہ بھی دوسرے ایکٹروں کی طرح کسی کی بھی بات نہیں سنے گا۔ یہ ہنر صرف اس عاصم بٹ کے پاس ہے کہ کس طرح کس کردار کو کہانی میں ڈالنا ہے اور ساتھ ہی کون سے کردار کو وہاں سے نکال لینا ہے۔ عاصم بٹ کی اس کمال ہنر مندی اور کرداروں کی لاہور سے جڑی حقیقی زندگی کو بیان کرنے کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"میں نے "دائرہ" کا پہلا نقش پڑھا تو محمد عاصم بٹ کو "ڈربے" کے مصنف اے حمید اور "ہزار داستان" کے مصنف ریاض شاہد کے قبیلے کا حقیقی ناول نگار قرار دیا کہ عاصم بٹ نے فصیل میں گھرے ہوئے پیچ دار اور پر اسرار لاہور کی معاشرت کو اس کے حقیقی رنگوں میں پیش کیا تھا۔ یہ متوسط طبقے کے ترجمان تھے اور اس معاشرے کے کرداروں کو ذہنی ساخت، اقدار کی پاسداری، رسوم و رواج کی پابندی اور ذہنی اور نفسیاتی جھمیلوں کے شاہد بھی تھے اور نباض بھی۔ لاہور کی اس مخصوص معاشرت کو غلام علی چوہدری، بانو قدسیہ، فرخندہ لودھی، سید امجد الطاف اور زہیرہ سمن علی نے بھی اپنی افسانوی آنکھ سے دیکھا اور اپنے فن کے "عجائب گھر" میں مستقل جگہ دے دی۔ محمد عاصم بٹ اردو افسانے میں وارد ہوئے تو لاہور فصیل سے نکل کر پھیلنا شروع ہو چکا تھا۔ آزادی کے بعد واہگہ کی دوسری طرف سے آنے والوں نے نئی بستیاں آباد کرنا شروع کر دی تھیں اور بڑے پیمانے پر اقدار کی شکست و ریخت عمل میں آ رہی تھی"[11]

کسی بھی معاشرے کی اقدار اس معاشرے کے باسی اپنے طرز زندگی سے ظاہر کرتے ہیں۔ حمید اختر کا کردار بھی لاہوری معاشرے کی زندگی سے جڑی اقدار کو ظاہر کرتا ہے اور اس کے ارد گرد چند ایسے کردار بھی ہیں جو ان اقدار کی پاسداری میں سست روی کا شکار ہیں۔

نوید:

عاصم بٹ کے ناول "دائرہ" کے بارے میں یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ اس ناول کا سب سے مضبوط کردار وہ ہے جس کا بنیادی کہانی سے بالواسطہ کوئی خاص تعلق ہی نہیں ملتا۔ نوید کا کردار اس کہانی کو چہرہ عطا کرتا ہے۔ نوید سے جڑے باقی سبھی کرداروں کا تذکرہ روایتی تو نہیں مگر بہت حد تک جاندار ہے۔ مثلا اس کے اپنے دوست کے متاثر کن کردار کی وضاحت کے حوالے مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

> "وہ شراب پی کر اپنے مشترکہ دوست عرفان ککو کے گھر سے نکلے تو دور پولیس کی گشتی گاڑی کو دیکھ کر فیتے کو مستی آتی ہے اور وہ نوید کا ہاتھ چھڑا کر شراب کی خالی بوتل ہاتھ میں لے کر گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگتا ہے ۔اوئے پلسیوں تہاڈی پین دے۔۔۔باہر نکلو چھوکری۔۔۔ جے اپنی ماں دا دودھ پیتا اے تے مینوں پھڑو۔ اوئے لوکاں نو وی پتہ لگے کہ میں وی کجھ کیتا اے۔۔۔اوئے شراب پیتی اے کوئی مخول نیئیں کیتا۔۔۔اوئے چھلڑ تہاڈی ماں۔۔۔"(۱۲)

اس موقع پر پنجابی الفاظ کا استعمال بر محل ہے اور چھلڑ کی اصطلاح نے پاکستان میں اپنی جڑوں کو بہت مضبوط کر لیا ہے۔ چھلڑ کی اصطلاح سے ایسا قاری محظوظ ہوتا ہے جو کبھی کسی چھلڑ کی دستبرد زد میں آیا ہو۔ بالکل اسی طرح نوید کا نفسیاتی تجزیہ نہ صرف بہت دلچسپ ہے بلکہ مصنف کے گہرے مشاہدے کی گواہی دیتا ہے۔ اگر اس کردار کا زمینی حقائق سے بہت گہرا تعلق ہے تو ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سارے نوجوان ہیں جو ان حقائق کو کبھی جھٹلاتے نظر نہیں آتے۔ اسی حوالے سے عاصم بٹ لکھتے ہیں:

"وہ ایسی شادی شدہ عورتوں کی تاک میں رہتا جو اپنے گھروں میں خوش نہ ہوں، خاص طور پر اپنے شوہر سے۔ وہ انہیں تاڑ لیتا، ان کا پیچھا کرتا، نظروں ہی نظروں میں انہیں ترغیب دیتا۔ انہیں بہلاتا پھسلاتا۔ حتی کہ ان کی توجہ پالیتا اور پھر پہلا پانسہ پھینکتا جو عموماً ٹھیک نشانے پر پڑتا۔ اپنے تجربے سے اس نے سیکھا تھا کہ یہ ہمیشہ ایک ہی طرح کا عمل ہے اسے بار بار دہرا کر ہو اس میں طاق ہو گیا تھا"(۱۳)

نوید کا کردار کسی داستان کا کردار نہیں ہے بلکہ اندرون لاہور کا کردار ہے۔ وہ نورین کو اپنے جال میں پھنسانے کی خاطر پہلے اس کے بہنوئی اور بہن کو کبھی موسمی پھلوں اور سبزیوں کے ساتھ اور کبھی عمدہ گوشت دے کر شیشے میں اتارتا اور نورین سے اپنا مطلوبہ مطلب نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کردار نگاری مصنف کا بہترین ہتھیار ہے جس کو وہ بار بار استعمال میں لا کر سرخرو ہو جاتا ہے۔ مصنف یہ ضمن گری اس چابک دستی سے کرتا ہے کہ کردار زندہ ہو کر کتاب کے صفحات سے باہر نکل آتا ہے اور قاری کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرتا ہے۔ محمد عاصم بٹ کی انسانی سائکی سے گہری واقفیت اور مرد کی نفسیات کو بھانپنے کی صلاحیت کے حوالے سے جمیل احمد عدیل اپنے مضمون 'دائرہ ایک اہم ناول" میں یوں لکھتے ہیں:

"دائرہ "میں کچھ مقامات تو ایسے ہیں جن میں کردار کی نفسیاتی کیفیات کو بڑی کامیابی کے ساتھ بیان کر ڈالا ہے۔ اس تیز ترین دور میں ناول نگار کو مبارکباد دیتے ہوئے "دائرہ" کے کردار نوید وید کا خاص طور پر ذکر کریں گے جو واقعی صحیح بھنورا ہے۔ اس کا التفاپن بڑا نیچرل ہے۔ یہ لچہ اپنے ہدف کی شادی شدہ بہن کو بھابھی ماں اور بھابھی بہن کہہ کر پکارتا ہے"(۱۴)

نوید کا کردار لاہور شہر کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے جس کا کوئی نہ کوئی نمائندہ گھر گھر میں موجود پایا جاتا ہے اور اپنی چالاکیوں سے بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو ایک منجھے ہوئے شکاری کی طرح جال میں پھنسا کر اس کا شکار کر کے اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔

بشیر پان والا:

لاہوری کلچر کی ایک بہت عمدہ مثال عاصم بٹ نے بشیر پان والے کے کردار کی صورت میں پیش کی ہے۔ناول کو آگے بڑھانے کے لئے اگرچہ یہ کردار بہت مختصر وقت کے لئے آتا ہے لیکن یہ لاہوری کلچر اور تہذیب کی بہت خوبصورت منظر کشی کرتا دکھائی دیتا ہے۔لاہور میں جگہ جگہ پان اور کولڈ ڈرنک کے کھوکھے موجود ہیں جہاں پر اکثر رش لگا رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک کھوکھا بشیر پان والے کا ہے جہاں پر عموماسات آٹھ گاہک ہر وقت ہی موجود دکھائی دیتے ہیں۔

پاکستان خاص کر لاہور کے اندر پان کھانے کا ایک خاص قسم کا کلچر ہے کہ جس گاہک نے پان کھانا ہو پان وہیں تیار کر کے کھوکھے پر کھڑے ہی اس کے منہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ کرنے بشیر پان والے کا معمول بھی یہی ہے ۔یہ کردار ہمیں بتاتا ہے کہ لاہور جیسے بڑے شہر کے اندر ایک ان پڑھ اور مزدوری کرنے والا بھی ملکی حالات اور سیاست میں کتنی دلچسپی لیتا ہے اور اسے اپنے ووٹ کی قیمت کا کس حد تک اندازہ ہے۔

وہ سارا دن میں لگا رہنے کے باوجود بھی ایسی خبروں کی تلاش میں رہتا ہے جو اسکے شہر اور ملکی ترقی سے جڑی ہوتی ہیں۔بشیر پان والے کا کردار ہمیں لاہوری ثقافت کی روح سے روشناس کراتا ہے کہ کس طرح ایک آدمی سارا دن کام کرتا ہے اور اپنی زندگی کو کس انداز میں گزارنا پسند کرتا ہے۔اسے اس بات سے غرض نہیں ہے کہ پان، سگریٹ، بیڑی، جوا اور ناچ گانا اس کے مذہبی معاملات میں کیا حیثیت رکھتے ہیں۔اسے اپنی زندگی اپنے طریقے سے جینی ہے اور اس کی نشاندہی عاصم بٹ نے ناول "دائرہ" میں بڑے احسن انداز میں کی ہے:

> "استاد جی پیلی پت!" اس نے گردن پھیر کر بشیر سے کہا جو مزے سے چھالیہ چبا رہا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر پر اس کا پسندیدہ گانا چل رہا تھا۔ "کجھ کھس گئی اے، میری ویہل دی قمیض اج۔۔" قریب سے گزرتے ہوئے ایک رکشے کی سمع خراش تیز پھٹ پھٹاہٹ نے اس کا مزہ کرکرا کر دیا۔ وہ باآواز بلند چیخ کر بولا "تیری پین۔۔۔۔" گالی کا رکشے والے نے کوئی نوٹس نہ لیا اور

مزے سے سامنے ڈیش بورڈ پر بایاں پیر چڑھائے آہستہ آہستہ بازار کے رش میں جگہ بناتا نکل گیا"(۱۵)

اس اقتباس سے لاہوری کلچر چھلکتا نظر آتا ہے کہ کس طرح لاہور شہر کا شہری اپنے باسیوں سے لاہوری پنجابی میں بات کرتا ہے۔ بلوگوں سے کس لہجے میں بات کرتا ہے اور گالم گلوچ سے بھی کام لیتا اور سامنے والا بھی اسے بنا کسی نوٹس کے بنا کوئی جواب دیئے گزر جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں اپنے کلچر کی نمائندہ ہیں۔ بشیر پان والا آنے والے گاہکوں سے بڑے منجھے ہوئے پنجابی لہجے میں بات کرتا ہے جو لاہوری تہذیب ثقافت کا اہم حصہ ہے۔ اس بات چیت اور آپس کے برتاؤ سے ہمیں لاہوری باشندوں کے رہن سہن اور آپس کی محبت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

امتیاز علی خان:

عاصم بٹ کے ناول "دائرہ" میں استاد امتیاز علی خان ڈھیلے ڈھالے کرتے اور سفید پاجامہ میں ملبوس کردار اس ناول کی جان ہے۔ عاصم بٹ نے ایسا سروں میں لتھڑا اور ثقافتی رنگوں میں رنگا ہوا ماحول تخلیق کر دیا ہے کہ یہ صرف اسی کا خاصہ ہے۔ امتیاز علی خان کا کردار بڑا مضبوط اور اور اتنا مسحور کر دینے والا کردار ہے کہ قاری اس کردار کی آواز کے صوتی آہنگ سے ہر لحظہ محظوظ ہوتا ہے اور اس صوتی آہنگ میں مٹھاس اتنی ہے کہ گویا قاری کے کانوں میں شیرینی انڈیل دیتا ہے۔ اس کردار کو عاصم بٹ نے دھیمی آنچ پر پکا کر پیش کیا ہے۔ ویسے تو مصنف نے باقی کرداروں کی بھی بڑی عمدہ صورت گری کی ہے اور انہیں لاہور شہر کی ثقافت کے ساتھ جوڑ کر لاہوری ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے لیکن امتیاز علی خان کا کردار الگ خوبیوں کا مالک ہے ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"بھروں کیسا ہے بھلا؟ یہ بڑی مونچھوں والا دیو ہے۔" امتیاز علی خاں مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اشارے سے اسے بتاتے کہ دیو کی کتنی بڑی مونچھیں ہونگی۔ وہ سمجھ جاتا کہ استاد صاحب موڈ میں ہیں۔ ہمیشہ کی طرح امتیاز علی خان اپنے بازو پھیلا کر توند کو کرتے میں خوب ابھارتے ہوئے سیدھے کھڑے ہو جاتے۔ پھر راشد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے

۔"بھروں بڑے قد والا اور شہ زور دیو ہے۔ یہ راگ کا انسانی روپ ہے جسے بڑے نائکوں نے اپنے وجدان کے زور پر دیکھا اور لکھا"(۱۶)

کردار نگاری کے اندر کمال جہاں عاصم بٹ کی بطور عمدہ تخلیق کار نمایاں طرز کی ایک شناخت بنتی ہے اور ساتھ سا مصنف کو بطور کہانے کار پس منظر میں بھی لے جاتی ہے۔ یہ وہ کہانی نہیں جو انگلی پکڑ کر اسے باغ ہزار رنگ کی چہل قدمی کرائے بلکہ کردار نگاری ہی ہے جو اسے نہلاتی بھی ہے اور مقناطیسی طاقت کی طرح ساتھ جوڑ کر بھی رکھتی ہے۔ کردار نگاری کے حوالے سے جمیل احمد عدیل یوں رقمطراز ہیں:

"یہاں رک کر ہم ناول نگار کو داد دیتے ہیں کہ اس نے امتیاز علی خاں کا یادرہ جانے والا کردار تخلیق کیا ہے۔ استاد مزکور کی شخصیت، وضع قطع، لباس اور حلی، ہ انداز نشست و برخاست ، تکلم، ترنم، تبسم،۔۔۔سب کچھ قابل فراموش ہے لیکن جس طرح وہ فن موسیقی کو کھولتا ہے یہ کچھ اسی کا حصہ ہے۔ استاد امتیاز علی خان کو دیکھ کر "گڈریا" کے حکیم ناصر سیستانی بے اختیار حاشیہ خیال میں ابھرتے ہیں جو اقبلاس کے متجر عالم تھے"(۱۷)

عاصم بٹ نے امتیاز علی خان کے کردار کو کو جیسے گروم اپ میں کیا ہے یہ واقعی ان ہی کا کمال ہے۔ عاصم بٹ کی مضبوط اور گہری آبزرویشن نے امتیاز علی خان کو ایک عجیب سی دلکشی اور شناخت بخشی ہے۔ مصنف نے تراش خراش کر امتیاز علی خان کو جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا سروں سے کھیلتا ہوا امتیاز علی خان بنا دیا ہے۔ امتیاز علی خان کا کردار لاہوری معاشرے کا وہ کردار ہے جو زندگی میں بہت لمبا پینڈا مارنے کی جستجو کرتے ہیں لیکن قسمت ان کا ساتھ نہیں دیتی۔ وہ زندگی میں لمبی چھلانگ مارنا چاہتا ہے لیکن تھوڑا سا دوڑے تو سانس پھول جاتا ہے۔ ایسے کردار زندگی میں توقع سے بہت زیادہ کامیابی اور شہرت، کچھ تشنگی، کچھ قیاس اور کبھی کبھی ناکامی کا منہ دیکھتے رہیں تو ان کا ٹھیک گزارا ہوتا ہے۔

ناول "بھید" میں لاہور شہر کے کرداروں کا تجزیہ:

کہانی فروش:

یہ ایک ایسا کردار ہے جو پنجاب کے لاہور شہر کے علاوہ بھی باقی بڑے شہروں میں نظر آتا ہے۔ ایک ان پڑھ سا آدمی کس مہارت کے ساتھ کسی بھی گاڑی میں پڑھے لکھے اور ان پڑھ لوگوں کو اپنا قائل کرتا ہے اس کی بہترین مثال یہ کہانی فروش کا کردار ہے۔ کہانی فروش جب گاڑی کے اندر داخل ہوتا ہے تو وہاں سواریاں اپنی اپنی منزل کی جستجو میں مگن ہوتی ہیں۔ آتے ہی وہ ان تمام لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بہت میٹھے میٹھے الفاظ بولتا ہے اور ان سب کی توجہ حاصل کر کے اپنی دکانداری شروع کر دیتا ہے۔

اگر چہ اس کے پاس جو بھی پراڈکٹ ہو اور چاہے وہ بالکل نقلی بھی ہو لیکن اسے اپنے کام میں اس قدر مہارت ہوتی ہے کہ کچھ نہ کچھ گاہک اس کی وہ پراڈکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ عاصم بٹ نے اپنے ناول میں ایسے کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ یہ کردار لاہوری معاشرے کے اس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے کہ اگر چاہے لاہور جیسے بڑے شہر میں شرح خواندگی بہت حد تک متاثر کن ہے لیکن اس شہر میں ایسے بے شمار فنکار پڑے ہیں جو کچھ بھی نہیں پڑھے ہوئے لیکن اپنی کمال مہارت کی وجہ سے وہ اپنا کام کرنا جانتے ہیں۔

عاصم بٹ نے بالکل عام سے کرداروں کو اٹھا کر لاہور شہر کی گھر گھر کی کہانی کو قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ یہ کردار ہمارے ارد گرد رہنے والے کردار ہیں جو ہمیں عام حالات میں نظر نہیں آتے لیکن جیسے ہی عملی طور پر ظاہر ہوتے ہیں ہمیں لگتا ہے کہ یہ تو جیتا جاگتا کردار ہے۔ یہ کہانی فروش سواریوں کو بڑی چالاکی اور ہنر مندی سے اپنی کہانی کے بارے میں بتاتا ہے کہ سننے والا اس کہانی کو خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جیسے ایک جگہ مصنف لکھتے ہیں:

> "یہ آگے چیئرنگ کراس تک رش ہے، اس کے بعد گورنر ہاؤس کا سٹاپ ہے جس سے کم ہی کوئی سواری بس میں بیٹھتی ہے۔ اس سے آگے کینٹ ایریا ہے، خاموش علاقہ۔ پھر کھل کر

بات ہو گی آپ سے۔ تو میں پوچھ رہا تھا کہ بھلا آپ کی توجہ کی کیا قیمت ہو گی۔ ایک حسین لڑکی، ایک تگڑا سا رومانس۔ پلاٹ کی گھمن گھیریاں، چونکا دینے والا اختتام۔ جنابِ والا، مجھے موقع دیجئے۔ یہ سب کچھ، جو آپ نے ارشاد فرمایا، آپ کی خدمت میں حاضر کر سکتا ہوں ، یہ ذرا ریگل چوک گزرنے دیں۔ توبہ ہے اتنا رش"[۱۸]

کہانی فروش کا کردار اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ لوگوں کا معیار زندگی کیا ہے یعنی ایک گنجان آباد علاقہ ہے اور یہاں پر روزانہ ہزاروں کی تعداد میں گاڑیاں سفر کرتے ہیں۔ ان گاڑیوں میں لوکل جتنی بھی گاڑیاں چلتی ہیں ان کے اندر ایسے بے شمار نیم حکیم، دواساز، کہانی فروش اور طب کی دکانیں اٹھائے پھرتے ڈاکٹر سفر کرتے ہیں اور لوگوں کو بغیر کسی فیس کے مستفید کرتے ہیں۔

ماسٹر ولایت علی:

عاصم بٹ کے ناولوں میں زندگی کے تمام شعبوں سے وابستہ کردار پائے جاتے ہیں۔ لیکن ایک بات خاص طور پر دیکھی گئی ہے کہ یہ تمام کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مصنف کا اتنا گہرا مشاہدہ قاری کو حیرت میں ڈال دیتا ہے کہ ایک مصنف لاہور کے گلی گلی میں رہنے والے کرداروں کو کس طرح جانتا ہے۔ ان کرداروں کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت کا اسے پتہ ہے جیسے وہ بالکل اس کے سامنے بیٹھے ہوں۔

ایسا ہی ایک کردار ماسٹر ولایت علی کا ہے۔ اس کردار کے توسط سے لاہور شہر کی اس تصویر کو دیکھا جا سکتا ہے کہ ایک مڈل کلاس طبقے کا شخص کس انداز میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس سے دین اور دنیا دونوں طرح کی زندگی کے تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ ایک مذہبی آدمی کی سوچ کس طرح دنیاوی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔

ماسٹر ولایت ولی روزانہ کے معمول کے مطابق صبح اٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے۔ نماز اس کا معمول ہے، اس کے بعد وہ چھت پر پڑے ہوئے برتن میں چھوٹے چھوٹے پرندوں کے لیے خوراک ڈالتا ہے۔

جیسے ہی سورج نکلنے کے قریب پہنچتا ہے وہ اپنی بیوی کو جگاتا ہے تا کہ اسے ناشتہ مل سکے۔ وہ روزانہ ناشتہ کرنے کے بعد اٹھارہ کلو میٹر ایک سائیکل پر جاتا ہے جو کہ اس کی ڈیوٹی میں شامل ہے۔

اگر چہ ماسٹر ولایت علی ایک مڈل کلاس مین کی سی زندگی گزار رہا تھا لیکن اس کے باوجود اسے ایک بہت بڑا دھڑکا بھی تھا۔ اس کی زندگی میں اس کے من چاہے سب لوگ تھے۔ اس کی بیٹی، ایک بیٹا اور بیوی۔ اسے اپنی بیٹی کے حوالے سے اتنے شبہات نہیں تھے لیکن اپنے بیٹے کے حوالے سے لگاتار پریشان رہتا۔ اسی حوالے سے عاصم بٹ اس کی کیفیات کو یوں قلم بند کرتے ہیں:

> "ماسٹر صاحب کو بظاہر سب کچھ حسب خواہش ملا تھا۔ شہر میں نوکری، اور اپنا گھر، سگھڑ اور وفادار بیوی ،ایک بیٹی اور ایک بیٹا ۔باعزت کیریئر اور ریٹائرمنٹ کے بعد کی آسودہ زندگی۔ بس ایک ہی دکھ تھا، اپنے بیٹے کی نااہلی کا جسے وہ فطرت کے انتظام کار کا ایک روپ سمجھتے تھے اور اسی لیے اس کے ناگزیر ہونے کا دکھ اٹھائے رہتے تھے۔ لڑکا پڑھائی سے بد ظن تھا، آس پاس لوگوں سے بیزار، معاشرتی نظام اور ملکی سیاست سے مایوس۔ وہ گھر سے بہت دور رہتا تھا"(۱۹)

ماسٹر ولایت علی کے بیٹے نوید کی سوچ اور ماسٹر کی اپنی سوچ میں بہت بڑا فرق نظر آتا ہے۔ دونوں کی سوچ کا یہ تضاد لاہوری معاشرے کے اس پہلو کو اجاگر کرتا ہے کہ ایک نئی جنریشن کس انداز میں سوچتی ہے کہ جیسے اس کے والدین کو کچھ پتہ ہی نہیں کہ زندگی کس طرح گزارنی ہے۔ اس حوالے سے رفاقت جی اپنے مضمون "عاصم بٹ کا بھید" میں لکھتے ہیں:

> "ناول نگاری کا فن ہے جو صدیوں اور نسلوں کے قصوں کو بامعنی انداز میں خود میں سمیٹ لیتا ہے۔ بھید ناول میں بھی نسلوں اور صدیوں کا تعارف موجود ہے لیکن مصنف نے جنریشن گیپ کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر بھی پیش کیا ہے۔ دو نسلوں کا تفاوت، خاندانی روایات پہ کیسے اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ سب اس ناول کے موضوع کا خاص حصہ ہے۔ باپ بیٹے اور باپ

بیٹی کے کرداروں کے ذریعے جنریشن گیپ یا نسلوں کی خلیج کو نہایت خوش اسلوبی سے واضح کیا گیا ہے"[۲۰]

عاصم بٹ نے اس کردار کے ذریعے لاہوری معاشرے کے بہت اہم اور خاص پہلو کی جانب اشارہ کیا ہے کہ آج کل کے دور کے بچے اتنے ایڈوانس ہو گئے ہیں کہ والدین سے جھوٹ بول کر کسی بھی جگہ چلے جاتے ہیں اور اس طرح وہ بری صحبت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ماسٹر ولایت علی کی وفادار بیوی کس انداز میں زندگی گزارتی ہے۔ اس کے گھر کا چال چلن سب کچھ واضح انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کی خوبی یہ ہے کہ ایسا لگتا ہے اس نے لاہور کی گلیوں میں موجود گھروں میں کئی سال گزارے ہیں اور پھر انہیں قلمبند کیا ہے۔

ڈٹرجنٹ پاؤڈر والی لڑکی:

محمد عاصم بٹ کے ناول "بھید" میں ہر کردار الگ الگ خوبیوں کا مالک ہے۔ کہانی فروش کی طرح ڈیٹرجنٹ پاوڈر والی لڑکی بھی ہے لیکن اس کی خوبیاں اور صلاحیتیں اس سے الگ ہیں۔ دراصل مصنف نے اپنے اس کردار کے ذریعے ہمارے معاشرے کے ایک ایسے پہلو کو اجاگر کیا ہے جس میں لوگ مجبوریوں کے مارے آن پھنستے ہیں۔

پاکستانی معاشرے میں سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں پر جب بھی کوئی عورت کسی بھی مجبوری کے تحت بازاروں کا رخ کرتی ہے تو مردوں کی آنکھیں اسے ایسے تاڑ رہی ہوتی ہیں جیسے بلی چوہے کو تاڑتی ہے۔ لاہوری مردوں کی اس خصلت کے بارے میں یاسر جواد لکھتے ہیں

> "لاہوری مردوں کا کہنا ہے کی عورت کو تاڑنا ایک صحت مندانہ سرگرمی ہے جو دماغ،، جسم اور روح کو آسودگی دیتی ہے۔۔۔ تاڑنا لاہوری مرد کا مسلہ ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کی عورت نے برقع پہن رکھا ہے یا نہیں۔ لاہور میں عورتوں کو گھورنے کا جن لازمی طور پر باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتا ہے"[۲۱]

ایسے معاشرے میں خوبصورت اور حسین لڑکیوں کا جینا کتنا محال ہے۔ مجبوریاں یہاں کتنی ہی خوبصورت لڑکیوں کو بے مول کر دیتی ہیں۔ ڈٹرجنٹ پاؤڈر والی لڑکی سے صارفی معاشرے کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ اس حوالے سے عاصم بٹ ناول 'بھید" میں میں لکھتے ہیں:

"ایسی قیمتی مسکراہٹ اس بیس پچیس روپے قیمت کے معمولی ڈیٹرجنٹ پوڈر کے لئے بازار کی زینت بن رہی تھی۔ یہ نئی منڈیائی دنیا کا ایک نیا رنگ ہے"(۲۲)

مغربی ممالک کے اندر اس طرح کی کوئی حرکت دیکھنے کو نہیں ملتی جو پاکستانی معاشرے میں اکثر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایک لڑکی دیکھی نہیں کہ اس کے پیچھے بھکاری کی طرح لوگ لگ جاتے ہیں۔ یہ اصل تصویر ہمارے لاہور ی معاشرے کی ہے جہاں عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ غربت کے ہاتھوں پسے ہوئے طبقے میں ایسے کئی کردار ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں جو اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر کوئی نہ کوئی قدم اٹھاتے ہیں لیکن ہر جگہ کھڑے ہوس کے بھیڑیے ان کو جینے نہیں دیتے۔ یہ لوگ ان کی مجبوریوں کو ان کی کمزوری بنا کر استعمال کرتے ہیں۔ جگہ جگہ ہوٹلوں، پارکوں، بازاروں اور تقریبات اور یہاں تک کہ ہر شعبے میں ایسے مجبور کردار ہوتے ہیں جن کی زندگیوں کو پامال کیا جاتا ہے۔

نمیرا:

نمیرا اس ناول کی ہیروئن کا کردار ہے۔ اس کردار میں کئی ساری خوبیوں کو دیکھایا گیا ہے۔ مصنف نے اس کردار کے ذریعے لاہور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ ایک جوان سال لڑکی جس کا مذہبی گھرانے سے بہت گہرا تعلق ہے لیکن وہ کن حالات سے گزرتی ہے۔ اس کے ارد گرد کے لوگ کس انداز میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

نمیرا ایک اٹھارہ سال کی خوبصورت لڑکی ہے جس کا والد ماسٹر ولایت علی ہے جو کہ ایک مکمل مذہبی زندگی کا خواہاں ہے اور کچھ حد تک اس کے گھر والے اسے خوش رکھنے کی خاطر اس کی باتوں کا احترام بھی کرتے ہیں۔ عاصم بٹ نے نمیرا کے کردار کے توسط سے لڑکیوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ نمیرا کی زندگی

میں بہت کم دوست شامل ہیں۔ خاص طور پر قابل ذکر صرف دو کردار ہیں۔ یہی کردار لاہوری زندگی کی کامیاب عکاسی کرتے ہیں۔ نمیرا ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے اور اس کی بہت گہری دوست ریشم بھی کئی سال تک اس کی کلاس فیلو رہی ہے۔ ان کی دوستی کا سفر بارہ سال کے لمبے عرصے پر محیط رہا ہے۔ ریشم اس کی ہم عمر لڑکی ہی تھی لیکن عشق وعاشقی میں پڑنے کی وجہ سے جلد جوان ہو گئی اور اس کی شادی اس کے عشق سے ہو گئی۔

ریشم جب سے اپنے سسرال گئی تب سے نمیرا اکیلی ہو گئی۔ وہ اپنی اس دوست سے چوری چھپے ملنے جاتی تھی لیکن شادی سے پہلے کیونکہ وہ اس کے گھر آنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ جب وہ اپنی دوست سے ملنے جاتی تو راستے میں کھڑے لڑکے کس انداز میں اس کو تاڑتے اور کس کس طرح کے ان پر جملے کسے جاتے ہیں اس کی منظر کشی محمد عاصم بٹ نے بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے:

> "تم اسے کالج جاتا دیکھ رہے ہو۔ کمر سے قمیض کھینچی ہوئی ہے۔ چلنے سے کھنچاؤ پڑتا ہے تو دونوں طرف کے سلائی کے دھاگے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ لمبے بالوں کو وہ گردن کے پیچھے باندھے ہوئے۔ پراندے کے ساتھ نہیں۔ نہ چوٹی بنا کر، بس ڈھیلے انداز میں ربن سے یا کلپ سے بندھے ہوئے، چہرے پر معمولی سا بکھرے ہونے کا تاثر دیتے ہیں"(۲۳)

اس اقتباس سے لاہوری معاشرے کے ٹین ایج لڑکوں کی حرکات و سکنات کو حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ عاصم بٹ نے لاہوری ثقافت کو اس کردار کے ذریعے سے یوں بیان کیا ہے کہ کس طرح سے والدین کی بے لوث محبت اپنے بچوں کی غلط تربیت میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ بچے کس طرح اپنے والدین کی آنکھوں میں دھول جھونک کر غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ جیسے کہ نمرا کا کردار مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس پر عمل پیرا نہیں نظر آتا ہے اور وہ ایک شاعرہ کا کردار بھی ادا کرتی ہے۔

نمیرا پڑھائی کا سہارا لے کر اور بہت سے مختلف کاموں میں لگ جاتی ہے۔ اس کے والدین اس بات سے بالکل ناآشنا ہیں کہ وہ اس پڑھائی کی آڑ میں کیا کر رہی ہے۔ رسمی طور پر ماسٹر ولایت علی روزانہ اس کے کمرے کا چکر لگاتا تھا لیکن وہ کبھی یہ نہیں جان پایا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ باپ کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ کس طرح ان کو دھوکا

دے رہی تھی۔ اس پہلو کو مصنف نے بڑی چابکدستی سے بیان کیا ہے۔ باپ کی بے لوث محبت کے حوالے سے عاصم بٹ لکھتے ہیں:

> "رات کو نہیں جاگتے پتر۔ رات کو نہیں جاگتے۔ رات میں چڑیلیں قبضہ کر لیتی ہیں پتر۔ جلدی سو جایا کرو۔ امتحان کی تیاری صبح سویرے کیوں نہیں کرتی۔ جلدی اٹھو، نماز پڑھو، پھر پڑھنے بیٹھو، دیکھو کہ دماغ کیسے فٹافٹ چلتا ہے۔ چوتھے گیئر میں۔ جلدی کھانا کھاؤ، دانت صاف کرو، اور نو بجے بستر پر لیٹ جاؤ۔ تو صبح سویرے نیند کھلے گی"(۲۴)

ماسٹر ولایت علی صاحب اپنی بے لوث محبت میں یہ بات کبھی نہ جان پائے کہ نمیرا کی دراز میں ایسی بہت سی کتابیں موجود ہیں جن کا نصاب سے کسی قسم کا تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ تمام رسائل اور ڈائجسٹ خان کباڑی سے وہ خرید لاتی تھی جس وجہ سے گھر پر کسی کو خبر نہ ہو پاتی۔

نمیرا پڑھی لکھی لڑکی تھی اور اس وجہ سے وہ ایک بہادر کردار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس کی دوست بلی جو کہ شادی کے تین سال بعد بھی کبھی واپس نہ آ سکی۔ نمیرا اس کی سوچ پر بڑی حیران تھی کہ وہ زندگی سے الجھنے سے کیوں ڈرتی ہے۔ آخر اسے اپنی زندگی کی تلخیوں کا سامنا کرنا چاہیے۔ دراصل مصنف نے اس پہلو کو اُجاگر کیا کہ ہمارے معاشرے میں عورت ہمیشہ مظلوم و مغلوب رہی ہے۔ اس کی سوچ پر ایک طرح کی بندش کا گہرا پہرا رہا ہے۔ وہ زندگی میں کوئی بھی فیصلہ خود نہیں کر سکتی۔ لیکن نمیرا کا کردار ذرا مختلف قسم کا کردار ہے جو لاہور کی پڑھی لکھی لڑکیوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

نوید:

ناول "بھید" کا مرکزی کردار نوید ہے جو کہ ہیرو کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے۔ یہ ماسٹر ولایت علی کا اکلوتا بیٹا ہے۔ نمیرا کا بڑا بھائی، ماسٹر ولایت علی اس کے مستقبل کے حوالے سے کئی سالوں سے پریشان تھا اور شاید جانتا تھا کہ یہ کبھی زندگی میں کچھ ایسا نہیں کر سکے گا کہ ایک بہتر زندگی گزار سکے۔ اس لئے اسے ہر وقت اس کی فکر

لاحق رہتی۔ نوید ایک من موجی لڑکا تھا اور اسکے اندر بہت ساری بری عادت تھیں جن کی توقع ماسٹر صاحب نے کبھی اس سے نہیں کی تھی۔

سگریٹ نوشی اس کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔ اس کے علاوہ طرح طرح کی کتب کا مطالعہ جو اسس میں اسکے جوانی کے زور کو ابھارتا تھا۔ ہر وقت گھر سے غائب رہتا تھا۔ جس کی کھوج ماسٹر صاحب نے لگالی تھی کہ وہ گندا انجن چوک کے پاس ایک سرخ انقلابی تحریک نامی سوسائٹی کا حصہ بن چکا ہے اور وہاں جا کر اپنا وقت صرف کرتا ہے۔

دراصل اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی جو اسے اس جگہ کھینچ لاتی۔ اس لڑکی کا نام رافعہ تھا جو کہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی اور وہ بھی بہت جلد جان گئی کہ وہ اسے کن نظروں سے دیکھتا ہے اور اس کے بارے میں کیسے جذبات رکھتا ہے۔ ماسٹر ولایت علی نے اس کے مستقبل کے حوالے سے کئی بار اس سے بات کی اور ایک دفعہ تو کسی جاننے والے کے توسط سے ایک گھی کی کمپنی کی ایجنسی بھی دلوائی لیکن وہ محبت کا شکار عشق میں یہ کام بھی نہ کر سکتا تھا۔ لہذا اس میں بھی فیل ہو گیا۔

مصنف نے اس کردار کے ذریعے لاہور شہر کی زندگی کے اس پہلو کو بیان کیا ہے کہ ایسے کتنے ہی نوید روزانہ اپنی زندگی میں کیوں فیل ہوتے ہیں اور زندگی کی راہ سے بھٹک کر غلط راستے پر چل نکلتے ہیں۔ اگرچہ نوید کے سامنے سعید موٹے کی کامیابی کا سارا ماجرہ تھا کہ کس طرح اس نے کامیابی کی منزل کو عبور کیا لیکن نوید نے ایک الگ ہی راستہ اختیار کیا اور زندگی میں ذلیل و خوار ہوا۔ اس نے رافعہ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تو اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ اس کی محبت سے انکار کر دیا جو کہ اس کو اندر سے اتنا توڑ گیا کہ پھر وہ کبھی زندگی کی طرف لوٹ ہی نہ سکا۔ اس کی محبت کس انداز میں فیل ہوئی اس حوالے سے عاصم بٹ یوں لکھتے ہیں:

> "میں کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ اصل بات یہ ہے کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ بابا بھی اس حق میں نہیں ہیں کہ میں شادی کے چکر میں پڑوں۔ کسی نے ان سے

میرے رشتے کی بات کی تھی۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ لڑکی ابھی پڑھ رہی ہے۔ پانچ سال تو مجھے پی ایچ ڈی کے لیے چاہیں، پھر جاب وغیرہ کروں گی"(۲۵)

اس محبت کے اظہار سے پہلے اس نے اپنے گھر والوں میں ایک ووٹ تو پکا کر لیا تھا کہ اس کی بہن نمیرا کو ساری باتوں کا پتہ تھا۔ اس کا ساتھ دینے کے لئے بھی راضی تھی لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نوید اس محبت کو حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ جب اسے محبت میں ناکامی ہوئی تو اس نے گھر چھوڑ دیا اور ایک ماہ بعد گھر لوٹ کر آیا لیکن وہ یہاں موجود نہیں تھا اس کا جی کہیں اور تھا۔ اس کا جی اس گھر میں نہ لگا اور وہ پھر سے غائب ہو گیا۔

ماسٹر صاحب نے اسے بہت ڈھونڈا اور اس کے لیے کئی نوافل اور منتیں بھی مانیں لیکن بے سود۔ ماسٹر صاحب کو نوید کے حوالے سے کوئی بھی خبر ملتی تو وہ دوڑ پڑتے اور ناکامی کا منہ دیکھ کر واپس پلٹ آتے۔ اس کردار کے ذریعے مصنف نے لاہوری معاشرے میں ماں باپ کی اپنی اولاد کے لیے محبت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک نافرمان بیٹے کے لیے بھی ماں باپ اپنی جان تک دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ماسٹر صاحب کو جتنی بھی بار اس کی کوئی خبر ملی وہاں ضرور گئے۔ لیکن آخر کار ماسٹر صاحب ہمت ہار گئے اور نوید بھی ایک مجنوں بن کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا یا۔

مجید للاری:

مجید لاہوری کا کردار لاہور شہر کے چائے کے چھوٹے چھوٹے ڈھابوں کی کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس کے کردار سے ایک اور بڑی اہم کہانی بھی جڑی ہے۔ یہ اس ہجرت کی کہانی ہے جس میں تقریباً چالیس لاکھ لوگ موت کی نذر ہو گئے تھے۔ یہ انیس سو سینتالیس کا وہ واقعہ ہے جو بزرگوں کے دلوں میں آج بھی نقش ہے۔ اس کہانی کی بڑی عمدہ صورت گری اس ناول میں کی گئی ہے۔

مجید لاری ایک چائے کا ڈھابہ چلاتا ہے اور اپنے کام میں اتنا ماہر ہے کہ کسی بھی گاہک کو دور سے دیکھ کر کر اس کے رویے کی جانچ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے ڈھابے پر پہنچتے ہی اس کے موڈ کے مطابق ایسی بات کرے گا کہ وہ ایک دم یہاں آ کر خود کو ہلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسے گاہک کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ہنر پوری

صلاحیوں کے ساتھ آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ڈھابہ سدا بہار ہے یعنی چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ مجید للاری اپنے کام میں اتنا ماہر ہے کہ اگر کسی گاہک کا من صرف چائے پینے پر ہے تو وہ اس سے ایسی باتوں میں لگائے گا کہ دو کلچے تو اسے کھلا کر ہی بھیجے گا۔ پھر چاہے گاہک کو واپسی پر پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ مجید للاری کے اس فن کی منظر کشی عاصم بٹ نے یوں کی ہے:

> "چوک متی سے اپنے کمرے تک واپسی کے راستے میں مجید لاری کا ہوٹل پڑتا تھا۔ وہاں سے نور جہان کی آواز آ رہی تھی، وے سونے دیا کنگنا سودا اکو جیہ، دل دینا تے دل منگنا۔ مجید للاری تام چینی کے بڑے پتلے میں گرم دودھ میں کڑچھا آگے پیچھے یوں چلا رہا تھا، جیسے اس محلول میں سے کچھ ڈھونڈ رہا ہو، اور کڑچھا جو خود بخود آگے نکل جاتا تھا، اسے بار بار اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔۔۔ "باؤ صاحب" وہ پکار رہا ہے۔ چھپ کر نکل جانے کی خواہش اور کوشش، سب بے کار ہے"(۲۶)

مجید للاری کا کردار لاہور کے اس پیشہ ورانہ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو صرف ایک چھوٹے سے ڈھابے سے اپنے گھر کا پورا نظام چلاتے ہیں اور ہر وقت اپنے رازق کا شکر ادا کرتے ہیں۔ مجید لاہوری ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان کے شہر لاہور میں آیا اور تب اس کی عمر صرف ایک سال تھی۔ لیکن اگر آپ اس سے ہجرت کا واقعہ سننا چاہیں تو وہ آپ کو سارا سارا دن سناتا چلا جائے گا۔ اس کو اپنی جنم بھومی سے اتنا پیار تھا کہ صرف اس کا نام للاری کہنے والا اسے سب سے زیادہ محبوب لگتا۔ اگرچہ وہ یہاں لاہور کا شہری بن گیا تھا لیکن اپنی جنم بھومی کی محبت میں ہمیشہ تڑپتا نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

> "اپنی جنم بھومی کو یاد کر کے مجید لاری آہیں بھرتا ہے۔ اسے نہ بتایا گیا ہو تا کہ اس کی جنم بھومی یہاں کے علاوہ کہیں اور ہے تو شاید اس کی یاد کے بوجھ سے آزاد ہو جاتا"(۲۷)

اس کردار کو اگرچہ ایک ان پڑھ کردار کے طور پر ناول میں شامل کیا گیا ہے لیکن اس کی حالات سے آگاہی اور اپنے وطن اور شہر کے حالات اور خبروں پر مکمل عبور اسے ایک سمجھ دار اور پڑھا لکھا اور اپنے وطن کے لئے فکر مند ثابت کرتا ہے۔ یہ کردار متنوّع قسم کی زندگی سے وابستہ نظر آتا ہے۔ ایک طرف ڈھابہ چلانے والا اتنا

باخبر شہری اور دوسری طرف ایک عاشق کا عکس بھی اس میں نظر آتا ہے۔ ایک دفعہ اس کے ڈھابے پر ایک عورت آتی ہے جو اس سے مفت میں دودھ کا پیالہ مانگتی ہے اور پھر چلی جاتی ہے۔ لیکن جب وہ جانے لگتی ہے تو وہ اس سے پیسوں کا مطالبہ کرتا ہے اور وہ انکار کر دیتی ہے۔ اس کے لیے ایک پیالہ دودھ کی کیا قیمت ہو گی لیکن وہ اس سے جھگڑتا ہے۔ وہ عورت اسے بد دعا دے کر نکل جاتی ہے جس سے اگلے دن اس کا دودھ پھٹ جاتا ہے۔

مصنف نے ان تمام مناظر سے دعا اور بد دعا کے حوالے سے ایک ایک چیز کو بڑے احسن انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں سے ہمیں لاہور شہر کی معاشرت کا حقیقی روپ نظر آتا ہے کہ یہ کردار ہمیں لاہور شہر کے ایک ایک کونے کی سیر کراتے ہیں اور ہمیں وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، لوگوں کی سوچ تک رسائی حاصل کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ارشد وحید اپنے مضمون میں یوں گویاں ہیں:

> "کہانی ایک روایتی اندازِ بیان سے ذراہٹ کر ہے۔ مختلف کرداروں کی کہانیاں ہیں، جو شہر کی گلیوں میں اپنے اپنے ماضی، اپنی اپنی خواہشات یا محرومیوں کے ساتھ، دھیمے انداز کے ساتھ اپنی اپنی کہانیاں سناتے ہوئے اصرار کرتے ہیں کہ، یہاں سے شہر کو دیکھو"(۲۸)

بالکل اسی طرح مجید لاہوری کا کردار بھی ہمیں لاہوری معاشرت کی سیر کراتا ہے اور ان پردوں کو چاک کرتا ہے جن کے بارے میں لوگ سوچ نہیں سکتے کہ ایک بظاہر سارا دن ڈھابہ چلا کر پیسے کماتا اور مسکراتا ہوا چہرہ کن محرومیوں کا شکار ہے اور اس کے دل میں کیا کیا خواہشات جنم لیتی ہیں۔ عاصم بٹ نے ایسے کرداروں کو اپنے ناول کا حصہ بنا کر لاہور شہر کے باشندوں کے دلوں میں جھانکنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ مجید للاری کے حوالے سے ارشد وحید اپنے مضمون میں یوں لکھتے ہیں:

> "اس ناول کے بعض کرداروں کو عاصم بٹ نے اتنا اچھا لکھا ہے کہ یہ کردار اب اسی نام سے یاد رہیں گے۔ مجید لاہوری کا کردار اور اس کی زبان عاصم بٹ نے اتی اعلی لکھی ہے کہ اسے زندہ جاوید کر دیا ہے"(۲۹)

کسی بھی ناول میں پیش کیے جانے والے معاشرے میں نہ صرف لوگوں کا رہن سہن، رسم و رواج اس معاشرے کے حقیقی پہلو ہوتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ زبان بھی بڑی اہم ہوتی ہے۔ مجید للاری کی زبان ہمارے سامنے لاہوری بولی کی عمدہ تصویر کشی کرتی ہے۔

مشتاق چھرا:

ناول "بھید" میں سب سے انوکھا کردار مشتاق چھرا ہے۔ یہ کردار ناول میں ضمنی کردار کے طور پر آتا ہے لیکن ایسے گہرے نقش چھوڑ کر جاتا ہے کہ قاری اسے بھول نہیں پاتا۔ جیسا کہ اس نام سے ظاہر ہے ایسا عجیب نام۔ مشتاق چھرا کو یہ نام ایک ایڈیٹر سے لڑائی کے نتیجے میں ملا تھا جب اس کے گلے پر اس نے چھرا تان دیا تھا اور پھر مستاق چھرا مشہور ہو گیا۔

عاصم بٹ نے اس کردار کے ذریعے لاہوری معاشرے میں ایک نامی گرامی بدمعاش کا عکس دکھایا ہے کہ ہمارے معاشرے میں لوگ کس طرح ایسے لوگوں کی آؤ بھگت کرتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ چاہے وہ دل میں ان کو گالیاں دے رہے ہوں۔ مشتاق چھرا ایک نامی گرامی آدمی تھا جسے لاہور کے شہر کے پولیس والے اکثر لوگ جانتے تھے اور اس کے ساتھ گہرے مراسم رکھتے تھے۔ وہ ایک نڈر کردار ہے جیسا کہ ایک صحافی کا ہونا چاہیے اور وہ بھی ایک صحافی ہی تو تھا۔ دراصل عاصم بٹ نے اس کردار کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک معاشرے میں لوگوں کے ساتھ ظلم و زیادتی ہوتی ہے اور پھر اس سے تنگ آکر وہ کس طرح غلط راستوں کو چن لیتے ہیں۔

مشتاق چھڑا کسی بھی شخص سے بات کرنے میں گھبرانے والا کردار نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کس جگہ پر کس شخص سے کس انداز میں بات کرنی ہے۔ اس کا مزاج ہر شخص کے ساتھ ایک جیسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ جس شخص سے بھی اس کے مراسم تھے تھوڑی بہت بے تکلفی کا عنصر اس میں ضرور آجاتا تھا۔ وہ ہر کسی کو اپنے طریقے سے ڈیل کرنا شروع کر دیتا تھا۔ اپنی مرضی سے اس کا نام بھی رکھ دیتا۔ اس حوالے سے مصنف یوں بیان کرتے ہیں

"وہ مجھے بھوت لکھاری اور بھوتیا کہتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی گھوسٹ رائیٹر کے کئی ترجمہ کر رکھے ہیں۔ نظام الدین کو نظم وضبط، نوید عمر کو ڈاکٹر نو، اور فرید اعوان کا ٹونسٹ کو پھیجا اوٹ پٹانگ پکارتا ہے۔ اس کے دیئے ہوئے نام ہی سارے میں چلتے ہیں۔ فرید اعوان کو چند ہی لوگ جانتے ہیں، بھیجا اوٹ پٹانگ کو سبھی"(۳۰)

مشتاق چھرا ایک منجھا ہوا صحافی ہونے کے ساتھ اپنی فیلڈ میں بہت کامیاب کردار ہے۔ اس کا تعلق اگرچہ سیالکوٹ سے ہے لیکن وہ لاہوری معاشرے کو بخوبی جانتا ہے اور اس میں اپنا نام پیدا کر کے یہاں کے لوگوں کو دن رات ایک چکر دینے میں مگن رہتا ہے۔ جہاں بھی جاتا ہے نقش چھوڑ کر جاتا ہے اور لوگوں سے اتنا بے تکلف ہے کہ کسی سے بھی کچھ بھی بات کر سکتا ہے اور سامنے والے جیسا اس کا نوٹس لینے کا سوچ ہی نہیں سکتے۔ مصنف نے ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو لاہور کی زندگی کی عکاسی تو کرتے ہیں لیکن ناول میں بہت کم وقت کے لئے وارد ہوتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے حرا فاطمہ اپنے ایک مضمون "بھید پر ایک نظر" میں لکھتی ہیں:

"بھید میں کہانی گم ہو جاتی ہے۔ کہانی بند مٹھی میں سے ریت کی طرح جب سرکنے لگتی ہے تو پھر کہانی میں دلچسپی کہاں رہ سکتی ہے۔ کبھی الیاس مندریاں والا اور کبھی مشتاق چھرا ضمیر حاضر اور ضمیر غائب کی طرح نمودار ہوتے ہیں۔ جبکہ باقی کردار اکائی صورت میں موجود ہیں مگر سب ایک دوسرے میں ضم ہو کر بھید کی کہانی کو بہاؤ کی شکل نہیں دیتے بلکہ کہانی میں رکاوٹ ضرور پیدا کرتے ہیں۔ اردو ادب میں ایسے کئی ناول موجود ہیں جہاں کردار مونتاج کی شکل اختیار کر کے ناول کی کہانی کو نہ صرف بنیاد فراہم کرتے ہیں بلکہ وہ کردار پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں بھی لے لیتے ہیں۔ میں تو برسوں پہلے پڑھے ہوئے علی پور کا ایلی کے شہزاد کو آج تک نہیں بھولی"(۳۱)

عاصم بٹ نے مشتاق چھرا کے کردار کے ذریعے اور اس سے جڑے دوسرے کرداروں کو ملا کر ایک مخصوص طبقے کی نمائندگی کی ہے کہ کس طرح ایک بدمعاش ٹائپ آدمی سے لوگ ڈرتے ہیں۔ چونکہ یہاں قانون نام کی کوئی چیز نہیں ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ ہمارے معاشرے کی روایت بن چکا ہے۔

مٹھو ایلین:

مٹھو ایلین جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ عجیب قسم کا کردار ہے لیکن یہ نہیں کہ وہ واقعی انسان نہیں تھا بلکہ وہ انسان تو تھا لیکن حالات نے اس کو ایسا بنا دیا تھا۔ عاصم بٹ نے بڑی چابکدستی سے معاشرتی نظام پر کاری ضرب لگائی ہے کہ کس طرح سے یہ معاشرہ ایک نوجوان کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے اعصاب پر قابو نہ پا سکے۔ مٹھو ایلین دراصل لاہور شہر کا ایک باشندہ ہے اور اپنی محرومیوں کے باعث اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ پایا۔

اس کا دوست مشتاق چھرا اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی کن مسائل کا شکار ہے اور وہ اس وقت کہاں پایا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ انسانوں کی طرح سوچتا نہیں تھا لیکن پھر بھی جس کام میں وہ لگا ہوتا تھا اس کی مکمل معلومات اس کے پاس ہوتیں۔ ایلین اور ہیومیلین کے بارے میں مکمل معلومات اس کے پاس تھیں ۔ وہ ان وجوہات کو جانتا تھا کہ کس طرح یہ ایلین اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے دوست مزے لے لے کر اس سے ہر بات کو بار بار پوچھتے تھے اور اس سے مخول کرتے تھے۔ اس حوالے سے سے مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "یہ ڈائنا سارز بھلا کیا تھے، یہی ایلینز تھے سے باؤجی، ایلینز۔ سب مارے گئے ۔ پتہ نہیں کیسے۔ لیکن اب پھر سے آئے ہیں ۔ وہ مونچھوں کے مقام پر بے ترتیب بالوں کے ننھے گچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتاتا۔ اسے ہر بات کا علم تھا۔ لیکن ہم تک یہ علم وہ جرعہ جرعہ پہنچاتا، ہماری حیرتوں کی انتہا تک ہمیں آزماتا"(۳۲)

مٹھو ایلین گھومنے پھرنے کا شوقین کردار ہے جو ہمیں لاہور شہر کے مختلف مقامات کی سیر کراتا ہے۔ کوئی بھی پارک ہو، مشہور میدان ہو، ہسپتال وغیرہ ہو۔ وہ ہر جگہ کی سیر کرنے کو پسند کرتا ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو لاہور کی معاشرت اور رہن سہن کی صحیح عکاسی کرتا ہے اور لاہور شہر کے مشہور مشروبات اور کھانے پینے کی اشیاء کو کی بھی بہت ساری معلومات قاری تک پہنچاتا ہے۔ اسی حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "اس سے ایک ملاقات جو ہرگز پہلے سے طے شدہ نہیں تھی، کمرشل مارکیٹ میں ہوئی۔ کمرشل مارکیٹ کا ریفریشمنٹ سنٹر اپنے فالسے، مالٹے، انناس کے جوس کی وجہ سے سارے

شہر میں مشہور ہے۔ یہ آپ کے ہونٹوں پر جامنی رنگ کی مہین تہہ جما دیتا ہے، گرمی سے بچنے کی راہ سمجھاتا ہے۔ آپ کہیں بھی جا رہے ہوں، اپنی خوشبو اور رنگت کے جادو سے اپنی طرف بلاتا ہے۔ رجھاتا ہے"(۳۳)

مصنف نے جہاں پر ہمیں چائے کا ڈھابہ چلانے والے، کہانی فروش، ڈٹر جنٹ والی لڑکی جیسے کرداروں کی کہانی بتائی ہے وہاں پر انہوں نے اسی معاشرے میں چلتے پھرتے ایسے کرداروں کی بھی نشاندہی کی ہے جو کہ اتنے سادہ طبیعت کے مالک ہوتے ہیں کہ انہیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ ان کا استحصال کس انداز میں کیا جا رہا ہے۔ انسانی نفسیات سے اتنی آگاہی اور اسے پھر ناول کے صفحات میں اس انداز میں پرو دینا کہ عام سا قاری بھی سمجھ پائے۔

عاصم بٹ نے مٹھو ایلین کے کردار کا سہارا لے کر انسانی نفسیات اور محرومیوں میں گرے ہوئے انسان کی سائکی کو بڑے احسن انداز میں بیان کیا ہے۔ یہی وہ کردار ہے جو لاہوری زندگی میں موجود بے حسی کی اصل روح کو پیش کرتا ہے۔ اس حوالے سے ایم خالد فیاض اپنے مضمون "عاصم بٹ کا ناول بھید" میں لکھتے ہیں:

"موضوعاتی اور فلسفیانہ حوالے کے سوا عاصم بٹ کا یہ ناول اپنے کرداروں اور ٹیکنیک کے حوالے سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے جو کردار دکھائے ہیں وہ خالص لاہوری کردار کہے جا سکتے ہیں۔ وہ چاہے الیاس مندریاں والا ہو، مجید لاہوری ہو، مٹھو ایلین ہو، ریاض مودا یا مشتاق چھرا ہو یا پھر سعید موٹا کہ جس کا کردار انتہائی مختصر ہونے کے باوجود کمال کا ہے۔ سب لاہوری ثقافت کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے کردار ہی کسی شہر کو تادیر زندہ رکھتے ہیں"(۳۴)

عاصم بٹ اپنے کرداروں کی نفسیات اور ذہنی کیفیات کو بڑے واضح انداز میں قاری کے سامنے پینٹ کرتے ہیں۔ قاری ان کرداروں کے ذریعے لاہور شہر کی اصل تصویر کو دیکھ کر اس زندگی سے جڑی حقیقتوں کو جان لیتا ہے۔

ریاض مودا:۔

یہ کردار ناول میں بہت مختصر وقت کے لئے رونما ہوتا ہے۔ یہ ایک لکھاری کا کردار ہے اور لکھاری ایسا ہے جو اپنے آپ کو دوسروں پر خود ہی فوقیت دینے کا مریض ہے۔ مصنف نے اس کردار کی ایک خوبی یہ بیان کی ہے کہ اپنی فیلڈ میں منجھا ہوا کھلاڑی ہے۔

پرانی انارکلی میں روزانہ کی بنیاد پر ایک محفل لگاتا ہے اور لوگوں کو اکٹھا کرتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو جمع کرتا ہے جو اس کے چاہنے والے اور اس کو برداشت کرنے والے ہوں۔ جو کوئی بھی اس کی محفل کے ارد گرد بھٹکتا گویا اس کی نظر سے بچ کر نکلنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا۔ وہ جسے بھی دیکھتا آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کرتا اور اسے قائل کر کے محفل میں بٹھا دیتا اور جب تک چاہے نہ کسی کو جانے نہیں دیتا۔ لوگوں کو مختلف قسم کے مشورے دیتا ہے اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔

ایسے کردار آپ کو لاہور کے گلی کوچوں میں اکثر ملیں گے جو معاشی معاملات سے بالکل آزاد ہوں گے۔ ایسے لوگ ان محافل کا انتظام اس لیے کرتے ہیں تا کہ ان کا وقت پاس کرنے میں مدد فراہم ہو سکے۔ ایسا ہی کردار ریاض مودا کا ہے ا۔ یسی محفل میں بیٹھنے والوں کو مفت مشورے ملتے ہیں۔ پھر چاہے اس مشورے کا حقیقت سے کچھ تعلق ہو یا نہ ہو۔ ایسا ہی ایک مشورہ ہمت خان ایک چائے پیتے ہوئے آدمی کو دیتا ہے۔ اس کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> "خالی پیٹ چائے قبض کرتی ہے، اور گیس بھی میرے مہربان۔۔۔ گیس معدے سے دماغ کو چڑھتی ہے، بندے کو پاگل بنا دیتی ہے۔ پٹھوں کو کھا جاتی ہے، انتڑیوں میں سوراخ کر دیتی ہے۔ خون کے دباؤ کو بڑھاتی ہے، عمر گھٹاتی ہے۔ نری موت ہے، اور یہ پیدا ہوتی ہے چائے سے"(۳۵)

ایسے کردار لاہوری ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں کہ یہاں پر آج تک جہالت اور نیم حکیم نظام قائم ہے۔ اگرچہ لوگ اعلی تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں لیکن اپنے معاشرے کو سرے سے تبدیل کرنے سے قاصر

نظر آتے ہیں۔ لوگ ایسی باتوں پر آج بھی یقین رکھتے ہیں جن کا حقیقت سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہی وہ کردار ہیں جو لاہ ور کی تنگ و تاریک گلیوں میں رہتے ہیں اور ان لوگوں کے بارے میں اکثر لوگ بے خبر رہتے ہیں۔ لیکن یہی کردار لاہور کی اصل حقیقت کو واشگاف کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ریاض مودا ایک پڑھا لکھا آدمی تھا جو اقبال کا بہت بڑا طالب علم تھا۔ کسی بھی محفل میں اقبال پر اگر کوئی بات ہوتی تو وہ فوراً اس سے بڑھ کر دلیلیں پیش کرنے لگتا۔ اپنی انار کلی کی محفل لگانے کے علاوہ اپنے دوست محصف حسن کی محفل کی بھی جان تھا جو ہفتے میں صرف تین بار لگتی تھی اور وہاں پر موجود لوگ ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔

دراصل یہ محفل لاہوری کلچر کی تصویر کشی کرتی ہیں کہ شام کے بعد لوگ کس انداز میں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو کر چلے آتے ہیں اور ان سے ان کا حال دریافت کرتے ہیں۔ مغربی ممالک میں نہیں دیکھا جاتا کہ لوگ ایک دوسرے کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے ہوں ان کا اس انداز میں خیال رکھتے ہوں۔ ایسا صرف پاکستانی معاشرے کا خاص وصف ہے کہ لوگ مختلف جگہوں پر جمع ہو کر مختلف موضوعات پر بات کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

معراج راجی:

محمد عاصم بٹ نے اپنے ناول "بھید" میں متنوع قسم کے کرداروں کو پیش کیا ہے۔ جن میں صحافی، ڈھابے والے، کہانی فروش، ڈٹرجنٹ والی لڑکی، ماسٹر ولایت علی، نوجوان لڑکے لڑکیاں اور اس طرح کے بے شمار کردار جن معراج راجی کا کردار ایک جاگیر درانہ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے کے جاگیر دارانہ نظام اور اس کے زیرِ تسلط ظلم و بربریت کو بڑی چابکدستی سے بیان کرتا ہے۔

جس محلے میں معراج رہتا ہے وہاں اور بھی بہت سارے زمیندار لوگ رہتے ہیں لیکن یہ سبز میندا روں کا باپ ہے یعنی اس کا اثر و رسوخ ان سب سے زیادہ ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس نے کبھی بھی کسی الیکشن میں حصہ نہیں

لیا لیکن اس کے باوجود بھی اس نے اپنے علاقے کے بڑے بڑے کام صرف اپنے اثر رسوخ کو استعمال کر کے کروائے تھے۔ کئی ٹیوب لائٹس، سڑکیں، پکی نالیاں، پانی کے پراجیکٹ وغیرہ وہ لگا چکا تھا۔ معراج راجی کا فارمولہ یہ تھا کہ جتنی بھی رقم فنڈز میں آتی اس میں سے آدھی لگا دو آدھی کھالو۔ اور وہ جو آدھی رقم لگاتا تھا اس آدھی رقم کو خرچ کرنے کے لئے بھی آدھی رقم اسے کھلانی پڑتی۔

اس ساری صورت حال کا اندازہ ایک صحافی کو ہو گیا جس نے اس کے خلاف خبر لگادی کہ اس نے فنڈز میں خرد برد کی ہے۔ جب معرار جی کو پتہ چلا تو اس نے صحافی کو بلوا کر اسے ڈرایا دھمکایا اور اسے اپنا ساتھ دینے کا فیصلہ سنایا۔ اسے پیسے اور موٹر سائیکل کی بھی پیشکش کی جس کو صحافی نے قبول کر لیا۔ یہ کردار حقیقی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جو کہ ہمارے معاشرے میں ایک ناسور کی طرح چھپا ہوا ہے اور لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے۔ کس طرح یہ لوگ اپنے تعلقات اور اثر ورسوخ سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کی زندگیوں سے کھلواڑ کرتے ہیں۔ اس کی بڑی عمدہ صورت گری عاصم بٹ نے اپنے ناول "بھید" میں کی ہے اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> "صبح سویرے فیجے کو بلا کر معراج گجر نے حکم دیا کہ لڑکی کی لاش کو لے جا کر کہیں پھینک آئے، یا دفنا دے، وہ بہتر جانتا تھا، کہ اس کا کیا کرنا تھا۔ فیجے نے لاش کو دیکھا تو جیسے سکتے میں آ گیا۔ وہ برہنہ تھی۔ اس کی ماموں زاد تھی، اور اس کی منگ بھی، دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ اگلی برساتوں تک دونوں کی شادی متوقع تھی۔ فیجے کی آنکھیں بھیگ گئیں۔۔۔۔ الو دا پٹھا۔ بکواس کرتا ہے۔ چل جا، لے جا اسے، ہمیں پتا تھوڑی تھا کہ تیری مانگ ہے۔ چل فکر نہ کر، اس سے ودھیا سوہنی ووہٹی لادوں گا تجھے۔ تجھ سے وعدہ ہے۔ ایک نمبر کی رن ہو گی۔ گارنٹی دیتا ہوں"(۳۶)

اس کردار کے ذریعے عاصم بٹ نے اس معاشرے کی تصویر کشی کی ہے جس میں غریب کی کوئی عزت آبرو نہیں ہوتی۔ ایک جاگیر دار جو چاہے اس کے ساتھ کر سکتا ہے۔ معراج نے اپنے ہی وفادار ملازم کی منگ کو رات کو اٹھا کر دوستوں سے مل کر اس کے ساتھ زیادتی کی اور اسے جان سے مار ڈالا۔

دراصل یہ کردار ہمارے معاشرے کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جو ہماری نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی اوجھل ہوتے ہیں۔ جاگیر دارانہ نظام کا ظلم و ستم اور خاص کر پولیس کلچر جو کہ ایسے زمین داروں اور جاگیر داروں کی ملکیت ہوتا ہے۔ وہ جسے چاہیں خرید سکتے ہیں اور جسے چاہیں جان سے مار سکتے ہیں۔ انہیں پوچھنے والا کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔ ایسے کردار ہمارے معاشرے میں بے شمار ہوتے ہیں جو لوگوں کے عزتوں اور مال و جان سے کھلواڑ کر کے خود کو بڑا حاجی اور صوفی ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن یہی کردار اصل ناسور ہیں جو ہمارے معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنتے ہیں۔

محصف حسن:

ہر کردار کی تصویر مختلف ہوتی ہے اور اس کا ناول میں رول بھی مختلف ہوتا ہے۔ ایسا ہی کردار محصف حسن کا کردار ہے جو کہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص ہے۔ اپنے محلے میں بڑا معتبر مانا جاتا ہے۔ اس کے دوستوں کا حلقہ کافی حد تک بڑا ہے اور سبھی اس سے محبت کرنے والے دوست احباب ہیں۔

جیسے ہی شام کا وقت ہوتا ہے اس کے دوست اس کی طرف لپکتے ہیں لیکن ایسا صرف ہفتے میں تین دن ہوتا ہے۔ اس محفل کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں پر سموسے اور چائے فری ملتے ہیں۔ لیکن صرف ان لوگوں کو جو اس محفل کا حصہ ہوتے ہیں ۔ یہاں سے یہ تاثر دیکھنے کو ملتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں ۔محصف حسن کی محفل میں جتنے بھی لوگ شامل ہوتے ہیں وہ سب لوگ زندگی کے کسی نہ کسی موضوع پر گفتگو کرنے جاتے ہیں۔ وہ گفتگو چاہے مذہبی ہو، سیاسی ہو، علمی ہو، ادبی ہو یا ثقافتی تمام موضوعات اس محفل کی جان رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی آراء کا اظہار کر کے دوسروں کو مستفید کرتے ہیں۔

دراصل عاصم بٹ نے ایک ایسے طبقے کی تصویر کشی کی ہے جو لاہور کی اصل ادبی روح ہے۔ یعنی لاہور میں ادیبوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ ادب کا مرکز مانا جاتا ہے اور اس کی دلیل عاصم بٹ نے ریاض مودا، محصف حسن جیسے کرداروں کو پیش کر کے ثبت کی ہے۔ یہ محفل ہمیں بتاتی ہیں کہ لاہور کے گلی کوچوں میں کتنے بڑے ادیب اور ادب کے پجاری بیٹھے ہیں جو کہ ادبی دنیا میں گمنام ہیرو ہیں۔ لیکن ادب سے دلچسپی ان کا مشغلہ ہے۔ ان کرداروں

کے حوالے سے جو ہمیں لاہور شہر کی سیر کراتے ہیں اور اس کی اصل روح سے روشناس کراتے ہیں مصنف یوں بیان کرتے ہیں:

> "ناول میں زندگی کے مختلف شعبہ جات سے جڑے لوگوں کی کہانیاں ایک دوسرے سے منسلک و پیوست ہیں۔ جس خوبی سے محمد عاصم بٹ صاحب ان کی تفصیل مہیا کرتے ہیں کہ کہانی پن بھی متاثر نہ ہو، اس سے ان کی منفرد قوت مشاہدہ کے علاوہ پختہ قوتِ بیان بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ خاص طور پر ادب، صحافت، موسیقی، اس کے علاوہ جاگیر دار اور درویشی کے لوازمات کے حوالے سے "(۳۷)

یہ تمام کردار مختلف کہانیوں کا مجموعہ نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں کی کہانیوں کو جوڑ کر پوری ایک کائنات تخلیق کر کے مصنف نے لاہور شہر کی بڑی عمدہ صورت گری کی ہے۔ مصنف نے ہر چھوٹے سے چھوٹے کردار کو اس طرح بیان کیا ہے جیسے اس نے خود اس کردار کی زندگی گزاری ہو اور اس کی زندگی کا حصہ رہا ہو۔ محمد عاصم بٹ کے کردار لاہور شہر سے جڑی زندگی کا مرقع نظر آتے ہیں۔

دونوں ناولوں میں لاہور شہر کے مقامی کرداروں کا تقابلی مطالعہ:

کسی بھی مصنف کا مضبوط ترین اور قابل بھروسہ ہتھیار کردار نگاری ہوتا ہے۔ جسے وہ اپنی تخلیقات میں جگہ جگہ استعمال کرتا ہے۔ کردار نگاری کے ہتھیار کو کو بروقت استعمال کرنا ہی کرداروں کو زندہ و جاوید بناتا ہے۔ کردار کتاب کے صفحات پر تو زندہ ہوتا ہی ہے ساتھ ساتھ اپنے معاشرے کے حقیقی عکس کو بھی پیش کرتا ہے۔

عاصم بٹ کے دونوں ناولوں میں پیش کیے جانے والے کرداروں میں حقیقی زندگی کے سبھی ذائقے موجود ہیں۔ عاصم بٹ کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس کا لاہوری زندگی کا بہت گہرا مشاہدہ ہے جو ہر کردار، ہر منظر اور ہر جز کو اپنی مکمل گرفت میں لینے کی کوشش میں رہتا ہے۔ ہمارے اردگرد کے کردار جنہیں ہم اکثر غیر اہم گردانتے ہیں لیکن عاصم بٹ کے ناولوں میں بھرپور وسعت کے ساتھ منظر عام پر آتے ہیں۔ پھر چاہے یہ فلموں میں کام کرنے کے خواہش مند نوجوان لڑکے ہوں یا کسی ہوٹل یا ڈھابے پر کام کرنے والے لڑکے ۔ مصنف گویا تمام کرداروں میں ان کا رنگ کشید کر کے ناولوں کے صفحات پر چھڑک دیتا ہے۔

جب ہم بات کرتے ہیں ناول " دائرہ" اور "بھید" کے مقامی کرداروں کی تو ہمارے سامنے لاہور شہر کی زندہ تصویر ر نظر آنے لگتی ہے جو کہ لاہوری زندگی کے مختلف پہلو اجاگر کرتی چلی جاتی ہے ۔ناول "دائرہ"کا مرکزی کردار راشد ہے۔ اس کردار کے اندر کئی شخصیات جنم لیتی ہیں۔ کبھی وہ آصف مراد بن جاتا ہے اور کبھی وہ امین گل کے گیٹ اپ میں آجاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک مڈل کلاس طبقے سے تعلق رکھنے والا لڑکا ہے۔ جو ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کام کرتا ہے اور ایک دن اچانک سے انکشاف ہوتا ہے کہ لوگ اسے ایک بہت بڑا فلم سٹار سمجھنے لگتے ہیں۔ آصف کی اس متضاد کیفیت کو حمید شاہد یوں بیان کرتے ہیں:

> "آپ کی توجہ عاصم بٹ کے ناول دائرہ کی طرف جانی چاہیے، جہاں امین گل نہیں رہتا۔ راشد ار آصف ہو جاتا ہے وہیں چکھ سجھائی نہیں دیتا کچھ سنائی نہیں دیتا اور حقیقت میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے "(۳۸)

یہ مشابہت اس حد تک ہوتی ہے کہ اس کی بیوی بھی ان میں فرق کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔ یہ دراصل اس کی داخلی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ دوسری جانب ناول "بھید" کا مرکزی کردار نوید ہے جو کہ ایک ماسٹر کا بیٹا ہے اور وہ بھی زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ سے گزرتا ہے۔ اسے ایک لڑکی سے عشق ہو جاتا ہے لیکن وہ اسے پا نہیں سکتا ہے لیکن آصف مراد نورین سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ آصف مراد ایک غیر مطمئن زندگی بسر کرتا ہے جبکہ نوید سرے سے زندگی سے عاری نظر آتا ہے۔

ناول دائرہ کا دوسرا مرکزی کردار نورین کا ہے جو کہ ایک گاؤں کی لڑکی ہے۔ نورین لاہور شہر میں آکر ایک لڑکے کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے۔ نورین ایک ڈرپوک قسم کا کردار ہے جبکہ "بھید" میں ہیروئن کا کردار رافعہ ادا کر رہی ہے جو کہ ایک قدرے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ اس کا اپنا ایک حلقہ احباب ہے جس میں وہ مشغول رہتی ہے۔ جب اس کا عاشق اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے تو وہ صاف منع کر دیتی ہے لیکن نورین کا مرکزی کردار اس کے مقابلے میں ڈرا ہوا اور سہما ہوا سا نظر آتا ہے۔

دراصل عاصم بٹ نے دونوں ناولوں کے نسوانی کرداروں میں تھوڑی جھجک دکھائی ہے۔ "دائرہ" کی ہیروئن دیہاتی ماحول میں جوان ہوتی ہے جبکہ "بھید" کی ہیروئن کو ایک شہری زندگی سے پالا پڑتا ہے۔ نورین لاہوری معاشرے کی ان لڑکیوں کی عکاسی کرتی ہے جو ایک خاص کیفیت کا شکار ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب نوید اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو مصنف نے یوں بیان کیا ہے۔:

> " نورین کو نوید کا یوں ٹکٹکی باندھ کر پیار بھری نگاہوں سے تکنا اچھا بھی لگ رہا تھا اور گھبراہٹ بھی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن وہ خوش تھی اور خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ نوید کی نگاہیں جیسے اسے گدگدا اور سہلا رہی تھیں۔ وہ خود میں نئی طرح کی نخوت اور خوشی محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی اس کے جسم کو ہولے ہولے مس کر رہا ہوں ہو "(۳۹)

جب کہ رافعہ مضبوط اور مرد کی محبت پر زیادہ بھروسہ نہ کرنے والی لڑکی ہے جو خالص لاہوری معاشرے کی عکاس ہے۔ اسے بچھڑ جانے کا ذرا بھی غم نہیں رہتا بلکہ وہ اپنے اس فیصلے پر پہلے سے زیادہ مطمئن نظر آتی ہے۔ لیکن نورین

اپنی محبت میں دھوکا کھا کر اس ادھورے پن کو ہمیشہ محسوس کرتی ہے اور آصف کی محبت کا سہارا لیتی ہے۔ بقول ارشد معراج:

> "انورین، نوید سے محبت کرنے اور اس کی ہوس کا نشانہ بننے کے بعد ادھوری رہ جاتی ہے۔ جسے وہ راشد میں مکمل کرنا چاہتی ہے۔ راشد اپنے اندر کہیں عدم تکملیت کا شکار ہے۔ سو دونوں اپنی اپنی جگہ ادھورے رہتے ہیں"(۴۰)

ناول "دائرہ" کا سب سے جاندار کردار نوید کا کردار جس کا بظاہر پوری کہانی سے کوئی خاص تعلق نہیں لیکن اس کی زندگی حقیقت سے قریب تر ہے۔ نوید کا کردار راشد کی طرح ماورائی نہیں بلکہ ایک جاندار کردار ہے۔ نوید کا کردار لاہور شہر کا ایک جیتا جاگتا کردار ہے جو کسی داستان کے کردار سے بالکل الگ ہے۔ نوید لاہور شہر کی ایک لڑکی کو اپنی محبت کے جال میں پھنساتا ہے اور اس کی جوانی کو باطل کر دیتا ہے۔

ناول "بھید" میں ریاض کا کردار اگرچہ اس قسم کی حرکات کرتا دکھائی دیتا ہے لیکن وہ نوید سے قدرے مختلف نظر آتا ہے۔ وہ بھی لاہوری لوگوں کو چکر دینے میں ماہر ہے لیکن وہ شکاری نہیں ہے۔ مصنف نے نوید کے ذریعے ایک ایسے نوجوان طبقے کی بڑی چابکدستی کے ساتھ عکاسی کی ہے جو ہمیشہ شاٹ کٹ کے چکر میں رہتے ہیں اور ان کے نزدیک اخلاقیات اور انسانی قدریں ذرا بھی اہمیت کے حامل نہیں ہوتیں۔

ناول "دائرہ" اور "بھید" کے باقی ثانوی کرداروں میں بہت سے کردار ہیں جو لاہور کی زندگی کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ "دائرہ" میں ایک کردار استاد امتیاز علی خان کا ہے جو کہ ایک بے اولاد موسیقار ہے اور ہیرو کی پرورش بھی کرتا ہے۔ یہ کردار اپنی ازدواجی زندگی سے غیر مطمئن نظر آتا ہے چونکہ کہ اس کی اپنی بیوی سے بنتی ہی نہیں جو کہ اس کی طرح کچھ زیادہ خوبصورت بھی نہیں تھی۔

مصنف نے سروں کے استاد امتیاز علی خاں کے ذریعے لاہور شہر کے ثقافتی ماحول کی بڑی عمدہ صورت گری کی ہے۔ جبکہ ناول "بھید" میں مجید لاہوری کا کردار اس کردار سے قدرے ملتا جلتا ہے۔ امتیاز علی خان شادی شدہ ہے اور بے اولاد ہے لیکن مجید بھی شادی شدہ اور وہ بھی ایک بے اولاد کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ دونوں کردار لاہور شہر کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں کہ کس طرح سے اولاد جیسی نعمت سے محروم لوگ زندگی میں حسرتیں پالتے ہیں

اور کن خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کردار کی کہانی موضوع کے اعتبار سے لاہوری زندگی کی سیاسی، ثقافتی اور معاشرتی زندگی سے مکمل ہم آہنگ ہے اور جدید عہد کی عکاس بھی ہے۔ بقول ڈاکٹر رشید امجد:

> "ہمارے عہد کی جدید حیثیت کو عاصم بٹ نے پورے خلوص اور تخلیقی قوت کے ساتھ کہانیوں کی صورت میں پیش کیا ہے"(۴۱)

ناول "دائرہ" میں اللہ داد کا کردار ایک جاگیر دارانہ نظام کا عکاس نظر آتا ہے۔ کس طرح وہ اپنی بیوی پر ظلم و ستم کرتا ہے اور دوسری شادی کرتا ہے۔ باپ کے نقش قدم پر چلنے والے بیٹے بھی گاؤں کی لڑکیوں کی عزتوں کو پامال کرتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں اپنے ڈیرے پر اٹھا کر لے آتے ہیں۔ جبکہ ناول "بھید" میں معراج کا کردار اسی نظام سے جڑا ہوا کردار دکھائی دیتا ہے۔ لاہور کے اندر بھی ایسے کئی جاگیر دار بیٹھے ہیں جو اس معاشرے میں ناسور ہیں۔ یہ جاگیر دارانہ نظام لاہور کے مضافات کے علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی عکاسی کرتا ہے۔

" دائرہ" کا کردار زمان خان ایک عام درجے کی زندگی گزارنے والا کردار ہے۔ جو لاہور شہر کے دفتری نظام کا مکمل عکاس نظر آتا ہے۔ اسی طرح "بھید" میں مٹھو ایلین کا کردار بھی معاشرے کے استحصال کا شکار نظر آتا ہے۔ زمان خان ایک عورت سے محبت کرتا ہے لیکن اسے پا نہیں سکتا۔ بنیادی طور پر وہ معاشرے کی نظروں سے ڈرتا ہے اور اس سے محبت کرنے والی زیتون بانو ایک طوائف کا کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے اندر ایک عجیب طرح کا ڈر ہے اور یقین نہ کرنے کی کیفیت۔ وہ زمان خان کی محبت کو بھی عام لوگوں کی طرح ایک جھوٹ ہی سمجھتی رہی۔

اسی طرح دونوں ناولوں میں نسوانی کردار معاشرے میں پسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ راشد اور نورین کی مائیں دونوں ایسے نسوانی کردار ہیں جو اسی طرح کے حالات کا شکار ہیں۔ دونوں اپنے شوہروں کے ظلم و ستم، مظالم اور استحصال کا شکار رہی ہیں۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے دونوں حالات سے بغاوت کر کے الگ راستہ اختیار کرتی ہیں۔ جب کہ "بھید" میں نسوانی کردار قدر مضبوط اور معاشرے کا سامنا کرنے والے دکھائی دیتے ہیں سوائے چند ایک کے۔ جیسے کہ نمیرا اور رافعہ کا کردار معاشرے کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے والے کردار ہیں۔

یہ نسوانی کردار لاہور شہر کی اصل تصویر پیش کرتے ہیں کہ یہاں عورت کی کیا حیثیت مانی جاتی ہے اور اسے اس کا مقام کیوں نہیں ملتا۔ڈاکٹر انور سدید عاصم بٹ کی کردار نگاری اور ان کے لاہوری زندگی سے لگاؤ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "عاصم بٹ کے کردار متوسط طبقہ کے کردار ہیں جو معاشرے کے جبر میں پس رہے ہیں' لیکن اپنی زندہ دلی سے جی رہے ہیں۔ عاصم بٹ نے معمولی باتوں سے کوئی غیر معمولی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایسی مانوس فضا پیدا کی ہے جو متوسط طبقہ کے ہر قاری کو اپنی فضا محسوس ہوتی ہے اور اس کی جمالیات سے فیض یاب ہوتا چلا جاتا ہے"(۴۲)

دونوں ناولوں میں لاہور کی زندگی کی مکمل عکاسی نظر آتی ہے۔بنیادی طور پر عاصم بٹ نے ساری زندگی لاہور کی گلیوں میں بسر کی ہے۔ جس کے باعث ان کرداروں کی کیفیات اور سوچ تک کو اچھی طرح جانتا ہے۔

"دائرہ" کے کردار اپنی زندگی میں احساس عدم تک ملیت کا شکار ہیں اور زندگی کی جستجو مین جان مارتے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر چاہے وہ امتیاز علی خاں ہو، راشد ہو، نورین ہو یا زمان خان۔ یہ سب کردار اپنی زندگی میں بہت ساری خواہشات اور شکایتوں کو دل میں جمع کئے بیٹھے ہیں اور اپنی خواہشات کو ہوا دینے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں خواب ٹوٹ نہ جائے۔جب کہ ناول "بھید" میں کچھ کردار ہیں جو اپنی زندگی سے مطمئن نظر آتے ہیں لیکن اکثریت یہاں بھی اپنی زندگیوں سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ پھر چاہے وہ ماسٹر ولایت علی ہو، نوید ہو، مشتاق چھرا ہو یا مٹھو اہلین۔ یہ تمام کردار ہمارے ارد گرد چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ یہ حقیقی لاہور کے عکاس ہیں۔عاصم بٹ کے کردار بہت کرب ناک زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔بقول آمنہ مفتی:

> "عاصم صاحب کے کردار جھے گا تھک لگتے ہیں۔ایک جھٹپٹے کا وقت، آدھی رات کی تاریکی ہے جو اں منظر ناموں پہ چھائی ہے۔یہ کہانیاں درد کی کہانیاں اور انہیں کہنے والا یقینا اپنے کرداروں کے کرب سے خود بھی گزرتا ہے"(۴۳)

ان ناولوں کے توسط سے جو ذہنی اور نفسیاتی زندگیوں کا مطالعہ عاصم بٹ کو اندرونی کیفیات کو بیان کرنے کا جواز پیش کرتا ہے۔ اس لیے تو ان کو کہانی کرداروں کے ذریعے بیان کرنی پڑتی ہے اور کرداروں کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ اس حوالے سے عرفان جاوید اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> "کردار نگاری میں کمال جہاں عاصم بٹ کی بطور عمدہ تخلیق کار ایک نمایاں شناخت بنتی ہے وہیں عاصم بٹ بطور کہانی کار پسِ منظر مین بھی لے جاتا ہے۔ یہ کہانی نہین جو قاری کی انگلی پکڑے اس باغ ہزار رنگ کی چہل قدمی کراتی ہے بلکہ کردار نگاری ہے جو اسے ٹہلاتی ہے۔ اور مقناطیس کی مانند ساتھ جوڑے بھی رکھتی ہے"(۴۴)

دونوں ناولوں کے کرداروں کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو مردانہ اور نسوانی کردار اپنی تمام تر خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ لاہور شہر کی زندگی کی حقیقی جھلک دکھاتے ہیں اور قاری کو سے لاہوری معاشرے سے تعلق رکھنے والے مختلف مسائل سے روشناس کراتے ہیں۔ خواہ وہ ازدواجی زندگی ہو یا پھر کسی اوباش لڑکے کی۔ یہی خوبی ان کرداروں کو زندگی اور رنگارنگی عطا کرتی ہے۔ نشیب و فراز زندگی کا حصہ ہیں جن کے نتیجے میں انسانی زندگی اپنے طور طریقوں اور انداز و اطوار کے لحاظ سے رنگ بدلتی رہتی ہے۔ ادب معاشرے کی اجتماعی ہیئت اور طرز معاشرت کا عکاس ہوتا ہے۔

زندگی کے مختلف زاویوں کو ایک ادیب اپنے انداز اور اسلوب سے تحریر میں پرو کر قاری کے حوالے کر دیتا ہے۔ قاری یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مصنف کے پیش کردہ خیالات کس حد تک معاشرتی زندگی سے جڑ کر انفرادی طور پر تاثیر کے درجے پر فائز ہوتے ہیں۔ معاشرہ اور فرد، جماعت اور انفراد، فکر اور ترنم حیات غرض کہ تمام لوازمات حقیقت بشریہ اپنے فطرتی تقاضوں کے تحت تخلیقی نہج پر لحظہ بہ لحظہ قاری کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عاصم بٹ نے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر کشی کرتے ہوئے پس منظر میں لاہور کو رکھ کر لاہوری ثقافت کو پیش کرنے کا منفرد انداز اپنایا ہے جو موجودہ دور کے قاری کی نفسیات سے مطابقت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۷

۲۔ ایضا، ص ۱۱

۳۔ ایضا، ص ۱۱

۴۔ روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، دستاویز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۴

۵۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۴۴

۶۔ صدف نقوی، محمد عاصم بت کی ناول نگاری، (مضمون) مطبوعہ، ادبی ادارہ نقاط، فیصل آباد، ۲۰۱۳، ص ۵

۷۔ غفور احمد، نئی صدی نئے ناول، دارالنوادر، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۶۲

۸۔ رابعہ الرباء، دائرہ، (غیر مطبوعہ)

۹۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۳۲

۱۰۔ یاسر جواد، آج کے مطبوعات، کراچی، س ن، ص ۱۰

۱۱۔ رابعہ الرباء، دائرہ، (غیر مطبوعہ)

۱۲۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۹۷

۱۳۔ ایضا، ص ۱۰

۱۴۔ جمیل احمد عدیل، دائرہ ایک اہم ناول، (غیر مطبوعہ)

۱۵۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۰۳

۱۶۔ ایضا، ص ۱۷۶

۱۷۔ جمیل احمد عدیل، دائرہ ایک اہم ناول، (غیر مطبوعہ)

۱۸۔ محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۲۷

۱۹۔ ایضا، ص ۳۵

۲۰۔ رفاقت حیات، محمد عاصم بٹ کا بھید، غیر مطبوعہ

۲۱۔ یاسر جواد، لاہور عظمتوں کی کہانی گناہوں کی داستان، آر۔ آر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۲۹

۲۲۔ محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء ۳۶

۲۳۔ ایضا، ص ۴۰

۲۴۔ ایضا، ص ۴۳

۲۵۔ ایضا، ص ۶۹

۲۶۔ ایضا، ص ۵۱

۲۷۔ ایضا، ص ۹۳

۲۸۔ وحید ارشد، بھید، ذاتی مخزونہ (غیر مطبوعہ)، ص ۶

۲۹۔ ایضا، ص ۱۳

۳۰۔ محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۱

۳۱۔ حرا فاطمہ، بھید پر ایک نظر، (مضمون)، مطبوعہ، ادارہ عبارت، ۲۰۱۹ء، ص ۵

۳۲۔ محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۱۳

۳۳۔ ایضا، ص ۱۱۵

۳۴۔ خالد فیاض، کلچر اور سویلزیشن کے اردو مبادلات و مفاہیم، (مضمون) مطبوعہ: دریافت، شمارہ ۵، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۵۷

۳۵۔ محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۳۰

۳۶۔ ایضا، ص ۱۶۰۔۶۱

۳۷۔ جمیل احمد عدیل، دائرہ ایک اہم ناول، غیر مطبوعہ

۳۸۔ محمد حمید شاہد، عاصم بٹ کے فکشن کی تخلیقی فضا، ادبی تنازعات حرف اکادمی، س ن

۳۹۔ محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۰۷

۴۰۔ ارشد معراج، دی ٹرائل اور دائرہ، تقابلی جائزہ، (ذاتی مخزونہ)، ص ۳

۴۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ماہنامہ اوراق، لاہور، ۱۹۹۸ء، س ن

۴۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، محمد عاصم بت کا پر اسرار ناول دائرہ، (تبصرہ) مطبوعہ، ماہنامہ اوراق، جلد ۳۶، شمارہ ۱،۲، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۲۱۷

۴۳۔ آمنہ مفتی، عاصم بٹ کا فن ناول نگاری، (مضمون) مطبوعہ، حلقہ اربابِ ذوق، لاہور، یکم ستمبر ۲۰۱۵ ، ص ۲

۴۴۔ عرفان جاوید، بلوریں دائرہ، مطبوعہ ادبی نقاط، فیصل آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۲

باب پنجم:

مجموعی جائزہ:

لاہور شہر کی اہمیت ہمیشہ سے مسلم رہی ہے۔لاہور شہر پاکستان کے صوبہ پنجاب کا دوسرا بڑا شہر ہے جو کہ پنجاب کا دارالحکومت بھی ہے۔لاہور شہر کی اہمیت کی بات کریں تو یہ ایک تاریخی شہر ہے جو کہ تقریبا ایک ہزار برس سے برِ صغیر کے اس خطے کا تہذیبی ،ثقافتی ،سفارتی اور سیاسی مرکز رہا ہے۔ لاہور شہر کو مغل دور حکومت سے تاریخی عمارات ،مساجد ،مقبروں ،قلعوں اور باغات کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل ہے۔ان میں شہزادہ جہانگیر کا مقبرہ،شالامار باغ، مقبرہ نور جہاں، مسجد وزیر خان، بادشاہی مسجد، مقبرہ آصف جہاں اور شاہی قلعہ نمایاں ہیں۔

اس شہر کو قبروں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ان میں کئی بزرگ صوفیاء کرام کے مزارات بھی واقع ہیں جن میں حضرت داتا گنج بخش، حضرت بھولے شاہ، مادھولال حسین، میاں مجزوب، حضرت میاں میر ،حضرت شاہ ابو المعالی، حضرت شاہ جمال ، علی حضرت موج دریا بخاری ،حضرت شاہ غوث اور حضرت میاں وارث شاہ شامل ہیں۔ محمد عاصم بٹ کا شمار اردو ادب میں ایک اہم فکشن نگار کے طور پر ہوتا ہے۔ عاصم بٹ اب تک تین ناول اور دو افسانوی مجموعے شائع کر چکے ہیں۔ ان ناولوں اور افسانوی مجموعوں میں انہوں نے لاہور شہر کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔لاہور کی تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی زندگی کو بڑے احسن انداز کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہ ایک فطری اصول ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی محبت میں مسلسل رہتا ہے تو اس کے خیالات کا اثر مصاحب کی طبیعت پر ہوتا ہے یہ اثر زبانی اور تحریر دونوں طرح سے ہوتا ہے۔سید امتیاز علی تاج ابتدائی طور پر ایک مترجم تھے لیکن بعد میں اس ترجمہ کے اثرات ان کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ اسی طرح احمد شاہ پطرس بخاری کی تحریروں سے متاثر تھے۔ لیکن جس طریقے سے انہوں نے ان تحریروں اور خالص طرز نگارش سے مزاح کی دنیا میں متعارف کرایا ہے وہ از خود ادب کا ایک روشن باب ہے۔

عاصم بٹ چونکہ اسی قطار میں کھڑے ایک مسافر ہیں۔لہذا لاشعوری طور پر ادیب ادب سے متاثر ہوتا ہے اور پھر منطقی نتیجے کے طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں کے فلاں ادب پر اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ فراز کافکا کی تحریروں کی جھلک عاصم بٹ کے کرداروں میں ملاحظہ کی جاتی ہیں۔ عاصم بٹ نے جہاں جہاں سراپا نگاری کی ہے اس میں کافکا کا ایک ہلکا سا عکس ہے۔نفسیاتی الجھنوں کا ایک سلسلہ جو عاصم بٹ کی تحریروں میں ملتا ہے وہ کافکا کی تحریروں کے تراجم کا نتیجہ ہے اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں کیونکہ عاصم بٹ کا تخلیقی جوہر ہے کہ وہ ان تحریروں سے متاثر ہو کر بھی پنجابی ثقافت یا لاہوری ثقافت کے خول میں رہتے ہیں اور قاری کو اپنے کردار کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ محمد عاصم بٹ اردو ناول نگار، مختصر کہانی کار، مصنف، مترجم، محقق، نقاد اور صحافی بھی ہیں۔ محمد عاصم بٹ نے انگریزی سے اردو زبان میں ترجمہ کر کے متعدد کہانیاں اور کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ تین ناول اور کی مختصر کہانیوں کے دو مجموعے شائع کیے ہیں۔ محمد عاصم بٹ انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ ان کی کئی اشاعتیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

محمد عاصم بٹ نے ۲۰۰۶ء سے ادبیات پاکستان میں حکومت پاکستان کے ساتھ "سہ ماہی ادبیات" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔عاصم بٹ کے افسانوی مجموعوں میں "اشتہاری آدمی" اور "دستک" شامل ہیں جبکہ ناولوں میں "دائرہ"، "ناتمام" اور "بھید" شامل ہیں۔اس کے علاوہ ان کے متعدد افسانے اور ایک ناول زیر اشاعت ہے۔ پاکستانی فکشن نگاروں میں محمد عاصم بٹ ایک بہت بڑا نام ہے۔ انہوں نے انگریزی سے اردو میں کئی کہانیاں ترجمہ کی ہیں۔

جن میں جاپانی کہانیاں جو جاپانی ادب سے منتخب کردہ کہانیاں ہیں۔ یہ سنگ میل پبلشرز سے ۲۰۱۹ء میں شائع کی گئیں۔ اسی طرح انگریزی کہانی کاروں میں مائیکل ایچ ہارٹ کی کہانی کا ترجمہ سو عظیم آدمی کے نام سے کیا۔اس کے علاوہ خلیل جبران کے محبت بھرے خطوط کا ترجمہ۔کافکا کی کئی منتخب کہانیوں کا ترجمہ جو کہ جنگ پبلشرز لاہور سے شائع ہوا۔مارکوپولو کا سفر نامہ بھی تخلیقات پبلشرز لاہور پاکستان سے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا گیا۔اس کے علاوہ محمد بن یحییٰ تخلیق کی تخلیقات کا ترجمہ اور توہمات کی دنیا کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔یہ تمام کہانیاں انہوں نے انگریزی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ کی ہیں۔ان کے علاوہ کئی کہانیاں جو ہیں وہ اور ترجمہ کر رہے ہیں۔

اسی طرح انہوں نے اردو سے انگریزی زبان میں بھی کچھ کہانیوں کے تراجم کیے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی تخلیق کلاسیکی کہانی قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ یہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد سے ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی اسکرپٹ اردو زبان سے انگریزی زبان میں ترجمہ کیے ہیں۔

اس کے علاوہ تحقیق و تنقید میں دوسرا آدمی اور جنگ نیوز پیپر میں انٹرویو جیو اور جنگ میں ان کے کئی انٹرویوز مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انسانی حقوق اور صفحات پر کئی پیپر چھپ چکے ہیں۔

عبداللہ حسین کی شخصیت اور فن ۲۰۱۶ء میں ادبیات پاکستان اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ لبرل فارم پاکستان بہترین افسانوں کا انتخاب ۲۰۱۱ء میں اور اردو کی مختصر کہانیوں کا انتخاب اور بے شمار کہانیوں کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔

محمد عاصم بٹ کو اپنی تخلیقات پر پاکستان میں ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ ان کے ناول "نا تمام" پر یو بی ایل لیٹریری ایکیلینس ایواڑ ۲۰۱۵ء مل چکا ہے۔ افسانوی مجموعے پر ادب برائے ادب ایوارڈ حاصل کیا۔ روبینہ سلطان نے جدید اردو ناول نگاروں کا تنقیدی تجزیہ پر مبنی ایک تفصیلی تحقیقی مقالہ لکھا جو ۲۰۱۱ء شائع ہوا۔ اس مقالے محمد عاصم بٹ کو پاکستان کے نو عمر ناول نگاروں کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ اس کے علاوہ عکس پاکستان اور برطانوی کونسل پاکستان کے زیر اہتمام ۳۰ اپریل سے یکم مئی ۲۰۱۳ء تک اسلام آباد پاکستان میں آکسفورڈ ٹریول میں شریک ہوئے۔

اس کے علاوہ محمد عاصم بٹ کے ادبی مقام کو متعین کرتے ہوئے کئی مصنفین نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ جن میں ڈاکٹر انور سدید، خالد فیاض، شفیق انجم، مستنصر حسین تارڑ، یاسر جواد، رفعت ناہید، رفاقت حیات اور کئی دیگر مصنفین شامل ہیں۔

اس کے علاوہ محمد عاصم بٹ کے ناولوں اور مختصر کہانیوں پر مختلف یونیورسٹیوں سے تحقیقی مقالات بھی لکھے جا چکے ہیں۔ جن میں پنجاب یونیورسٹی لاہور، نمل یونیورسٹی اسلام آباد، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد، اسلامک

انٹر نیشنل یونیورسٹی اسلام آباد، لاہور یونی ورسٹی اور کئی دیگر یونیورسٹیوں سے ان پر تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ ہان کے ادبی مقام کو متعین کرنے کے لیے مختلف یونی رسٹیوں سے تین تحقیقی مقالات جاری ہیں۔

مقالے کا دوسرا باب لاہور شہر کی مخصوص ثقافت کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اس باب میں ثقافت اور لاہور کی ثقافت پر بات کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں لاہور شہر کے مخصوص کلچر اور لاہور شہر کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ لاہور شہر کے اندر تاریخی مقامات اور ان کی تاریخی اہمیت کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ لاہور شہر کی جغرافیائی حدود اور آبادی کے تناسب اور رہن سہن کو بیان کیا گیا ہے۔ لاہور کو پنجاب کا دل کہا جاتا ہے۔ جب پنجاب کی ثقافت اور تہذیب کا تذکرہ آتا ہے تو متنوع قسم کی روایات اور میلوں ٹھیلوں، شادی بیاہ، سیر وسیاحت گو کہ ہمہ جہت پہلوؤں کا ایک خوبصورت گلدستہ ذہن کے سفر خیالات پر گردش کرنے لگتا ہے۔

اسی طرح مقالے کے تیسرے باب میں محمد عاصم بٹ کے ناولوں "دائرہ" اور "بھید" میں لاہور شہر کے بیان کردہ مقامات کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس تجزیاتی مطالعے میں دونوں ناولوں میں پیش کردہ مقامات کی تاریخ اور ارتقا کا جائزہ اور موجودہ صورت حال کو بیان کیا گیا ہے۔ لاہور شہر تاریخی اور ثقافتی مقامات کے علاوہ شہر کے مقامی اور نجی مقامات کا جائزہ اور لاہوری کلچر میں ان کی پہچان واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

رنگارنگ قسم کے حسین امتزاج کو کئی لکھاریوں نے اپنے اپنے انداز میں اپنا موضوع سخن بنایا۔ انہیں لکھاریوں میں سے عاصم بٹ وہ لکھاری ہیں جنہوں نے پنجابی ثقافت یا لاہور کے مشہور اور غیر مشہور مقامات کا تذکرہ اس خوبی سے کیا ہے کہ قاری خود راہی بن کر لاہور کے ان چوراہوں چوکوں اور مختلف مقامات کے گرد چکر کر لگاتا ہوا نظر آتا ہے۔ کسی بھی ناول، افسانے یا صنف شاعری میں تذکرہ مکانی مخصوص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مقام اپنی تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

جب ہم تاریخی اہمیت کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہاں بیان کردہ مقام یا مذکورہ جگہ مختلف زمانوں میں کن کن مراحل سے ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ مقام تک پہنچی ہے اور تہذیبی اہمیت یہ ہے کہ جس مقام کو بیان کیا گیا ہے اس کا ہماری تہذیبی اقدار یا ہماری تہذیبی فضا سے کیا تعلق رہا ہے۔ اور موجودہ زمانے

میں کیا مقامی پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ثقافتی پہلو سے دیکھا جائے تو اس مقام کا فن تعمیر، خط و خال اور علامتی اظہار کیا بنتا ہے۔ اور اپنے اندر کون سی چیزوں کو سموئے ہوئے ہے۔

عاصم بٹ نے اپنے ناولوں میں جن مقامات کا ذکر کیا ہے ان میں چند ایک تاریخی مقامات کے علاوہ کچھ ایسے مقامات بھی ملتے ہیں جو کہ لاہور شہر کے موجودہ چوراہوں، چوکوں اور سڑکوں پر ہمیں روزانہ کی سرگرمیوں میں نظر آتے ہیں۔ یہ مقامات لاہور کی تہذیبی و ثقافتی اہمیت کے حوالے سے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ان مقامات پر روز مرہ کی زندگی کے معمولات کے مطابق لوگ اپنی ضروریات زندگی کے حوالے سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ جیسے کہ چاچے دا چھابا یا اعظم ٹی سٹال، شیخ سویٹس، کاشان پلازہ اور اس طرح کے بے شمار مقامات ان ناولوں میں بیان کیے گئے ہیں۔

یہ وہ مقامات ہیں جو لاہور شہر کو کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اگر دیکھا جائے تو عاصم بٹ کے بیان کردہ مقامات ماورائی نہیں ہیں کہ کسی کھنڈر کی صورت میں ہوں یا ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں لیکن تجسیم نگاری کے دائرے میں آتے ہیں۔ عاصم بٹ کے مذکورہ مقامات منہ بولتی زمینی حقیقتیں ہیں اور پیش کردہ مقامات بھی ایسے ہیں کہ قاری دیدہ ہو یا نہ دیدہ ہو لاہور کی سیر کرنے لگتا ہے۔

عاصم بٹ کے پیش کردہ مقامات کو مجموعی طور پر دیکھیں تو متحدہ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ اور نو آبادیاتی نظام کے طویل تسلط کے نتیجے میں لاہور کی سڑکوں اور اداروں وغیرہ کے نام غیر اسلامی نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ کاٹ گنگا سنگھ روڈ، گنگا رام ہسپتال، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، گلاب دیوی ہسپتال وغیرہ۔ ایسے دسیوں نام ہیں جو لاہور میں اور دیگر شہروں میں دیکھے جاتے ہیں۔ بالخصوص لاہور ایسے ناموں سے بھرا پڑا ہے اور یہ لاہوری ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔ ان مقامات کا تعلق تاریخ سے جبکہ لاہور کو لاہو نے آباد کیا تھا جو کہ ایک غیر مسلم تھا۔ بعد میں محمود غزنوی کے دور میں ذلت کا خاتمہ کا معنی رکھنے والا لفظ لاہور نام رکھا گیا۔

اسی طرح مقالے کے چوتھے باب میں دونوں ناولوں میں پیش کردہ لاہور شہر کے مقامی کرداروں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان کرداروں کا رہن سہن، کلچر، تہذیب اور دیگر معاملات کو کس طرح لاہوری معاشرے کی عکاسی کا

ایک جز بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اور دونوں ناولوں کے کردار کس طرح ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دیتے اور ان میں کیا کیا چیزیں مشترک ہیں۔ چوتھے باب میں ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

کسی بھی داستان، افسانے، ناول، ڈرامے یا کسی منظوم کہانی کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے یا اس کا ادبی مقام متعین کرتے وقت کردار کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ کہانی میں پیش آمدہ واقعات اپنے انہی کرداروں سے رونما ہوتے ہیں اور ارتقائی کردار کے تحت مختلف انداز میں وجود پذیر ہوتے ہوئے کہانی کی تشکیل و تعمیر میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ کردار بنیادی طور پر دو طرح کے ہوتے ہیں جن میں ایک جامد کردار ہوتا ہے جو ایک خاص گروہ کی نمائندگی کرتا ہے لیکن زندگی کے تغیر و تبدل کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ دوسری قسم ڈرامائی کردار ہے جو زمان و مکان اور بدلتے ہوئے واقعات کے ساتھ تغیر پذیر ہوتا ہے۔

کسی بھی مصنف کا وہ کردار کامیاب سمجھا جاتا ہے جو علمی انسان ہوں لیکن اپنی انفرادیت کے بل بتے پر غیر معمولی گردانا جاتا ہے۔ وہ پہلے سے مصنف کے قلم کی نوک پر ناچنے والا کردار دار نہیں بلکہ اس کی اپنی شخصیت ہو اور فطرت کے مطابق ہو۔ جیسا کہ ہیقرے نے کہا ہے کہ میرے کردار میرے قابو میں نہیں بلکہ میں خود ان کے قابو میں آتا ہوں۔ اور جہاں وہ چاہتے ہیں مجھے لے جاتے ہیں۔

لیکن عاصم بٹ کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو بیان کرتے ہوئے جامد اور ڈرامائی کرداروں کے حسین امتزاج کو لے کر فطری بہاؤ میں واقعات کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے پیش کردہ کردار اپنے اعمال واقبال ، مکالموں اور اندازِ نشست و برخاست سے ایسا عملی پیکر آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں کہ قاری کہانی کے تسلسل کے ساتھ فطری اور منطقی انداز میں اسی مقام پر وہی کیفیت محسوس کرتا ہے جو کہ کردار کو درپیش ہوتی ہے۔

یہی وہ احساس عمل ہے جب کوئی مصنف قاری اور خارجی فرد کو داخلی کیفیت میں گوکہ مدغم کر لیتا ہے تو کہانی الحقیقت صفحہ قرطاس سے لفظی پیکر سے ہو کر ذہن انسانی کے تفکر اور اور تخیل کا حصہ بن جاتی ہے۔ جذبات کے اس اختلاط اور ارتباط پر کہانی کے اثرات کا انحصار ہوتا ہے۔

اس باب میں کرداروں کی کیفیات کی بات کریں تو معلوم ہو گا ایک جگہ کہانی کے کردار آصف کے ذہنی ارتقا جو کہ ماضی کے دھندلکوں میں کھویا ہے۔ اس کی اندرونی کیفیت اور نفسیاتی رویے کو جانچا گیا ہے کہ کچھ برسوں بعد جب آصف مراد نے تعلیم کو خیر باد کہا اور معاشی مجبوریوں کے تحت ملازمت اختیار کی اور وہیں کئی سال بیت گئے۔ اور پھر اس نے ایک روز اپنے ماضی کی یادوں کو کھنگالنے کی کوشش کی تو اسے اس پر اپنا چہرہ بالکل یاد نہ آیا۔

اگر مصنف کے انداز نگارش کے ساتھ ساتھ کردار کی نفسیاتی الجھنوں اور اختلافِ ذہنی کو عیاں کرتی ہوئی تحریر کردار کے معاشی مجبوریاں، شخصی انتشار اور استقلال خارجیت کے مفقود ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس باب میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دوسرے لاشعوری رویے عاصم بٹ اپنی خاموش طبعی، کم آمیزی اور خلوت پسندی کے باوجود نفسیاتی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ عاصم بٹ کو بدرجہ اتم احتیاط کے باوجود جنسی عوامل کو بیان کرنے کے لیے نورین کے کردار کو بیان کرتے ہوئے لکھنا پڑا۔ وہ تو دیہات کا نازک سا بھول تھی اور شہر کے باغ میں کھلی تھی۔ پر ابھی وہ کلی ہی تھی۔ ہر رنگ آئے گا جب کوئی بھنورہ اس کا رس چوسے گا۔

چوتھے باب میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عاصم بٹ کے کرداروں کی سراپا نگاری ہو یا انداز تکلم ،ان کا پس منظر زیرِ بحث ہو یا انکی زندگی کا ارتقاء۔ اس خوبی کے حوالے سے ابو الاعجاز حفیظ صدیقی بڑے عمدہ انداز میں لکھتے ہیں۔ عام طور پر ادیبوں نے اپنی تخلیقی اور فکری زندگی میں ایسی تفصیلات نہیں چھوڑیں جن سے معلوم ہو سکے کہ ان کا فلاں کردار فلاں شخص کا عکس یا ادبی روپ ہے یا یہ فلاں کردار کو تخلیق کرنے میں فلاں شخص محرک ثابت ہوتا ہے یا فلاں کردار کے بعض عادات و خصائل فلاں شخص سے مستعار ہیں لیکن اس امر کی وافر شہادتیں موجود ہیں کہ ادبی دنیا کے بہت بڑے کردار ان کے خالقوں کو عملی زندگی میں جیتے جاگتے اشخاص کے روپ میں ملتے تھے۔

اگر چوتھے باب میں پیش کردہ دونوں ناولوں میں پیش کردہ کرداروں کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو بڑے واضح اور صاف انداز میں یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ فی الحقیقت عاصم بٹ کے پیش کردہ کرداران کی اپنی زندگی میں آنے والے اشخاص سے مستعار ہیں جو پھرتے اور بولتے چلتے، اٹھتے بیٹھتے ان کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ مصنف کی قوتِ مشاہدہ اور ودیعت کردہ حسِ تحریر میں لکھاری لکھتے وقت جملوں، مناظر اور استعاروں میں جان ڈالنے کے

لیے ہمارے معاشرے پر نگاہ رکھے ہوئے ہوتا ہے کہ کب، کون، کیوں اور کیسے اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس باب میں لاہور شہر کے باسی کرداروں کے ذریعے لاہور کی اصل تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

تحقیقی نتائج:

۱۔ محمد عاصم بٹ نے لاہور شہر کے مقامات اور کرداروں کو ان کے حقیقی روپ میں ناولوں کے صفحہ قرطاس پر منعکس کیا ہے۔ تاریخی مقامات کے ساتھ ساتھ مقامی نوعیت کے مقامات کو بھی پوری آب و تاب کے ساتھ دکھایا ہے۔ عام طور پر لوگ ان مقامات کی خوبصورتی اور اہمیت کی طرف توجہ نہیں دیتے لیکن ان ناولوں کو پڑھنے کے بعد قاری ان مقامات کی تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی اہمیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ مقامات کا بطور پس منظر مطالعہ اپنی انفرادی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ مناظر جن مقامات پر دکھائے جاتے ہیں انکا براہ راست تعلق موجود رہتا ہے۔ اور اس تعلق کو بخوبی برقرار رکھنے کے لیے تخلیق کار کو مخصوص طرز کا اسلوب درکار ہوتا ہے۔ جس کے بغیر تحریر پھیکی اور تاثیر دھیمی ہوتی ہے۔ لیکن عاصم بٹ نے تحریر اور تاثیر کے حسین امتزاج کو کمال دستی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

۲۔ محمد عاصم بٹ نے عصری اسلوب کے ساتھ زمین سے کرداروں کو جوڑ کر ان مقامات کی عکاسی اپنے منفرد انداز میں کی ہے۔ ان کا انداز نہ طلسم ہوشربا کی طرح ہے اور نہ فسانہ آزاد کی طرز پر ہے وہ بلکہ سادگی اور سلاست سے معمور ہے۔ اکثر تاریخی مقامات کی موجودہ صورت کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخی اہمیت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اگر ان مقامات کے ماضی پر نظر دوڑائیں تو موجودہ صورتحال یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ جدید دور کے تقاضوں کے تحت کئی تبدیلیاں کی جاچکی ہیں۔ زمان و مکان کی وحدت کو بدرجہ اتم پیش نظر رکھا ہے۔

۳۔ محمد عاصم بٹ کے ناولوں میں جتنے بھی کردار ہیں وہ لاہور شہر کی حقیقی زندگی سے تعلق رکھنے والے مقامی کردار ہیں اور کردار لاہور شہر کی روح میں بسنے والے کردار ہیں۔ مصنف نے اپنے ان کرداروں کو لاہور شہر کی روح سے جوڑ کر ناولوں میں منعکس کیا ہے اور انہیں کرداروں کے ذریعے لاہور شہر کے مقامات کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ عاصم بٹ چونکہ خود لاہور کی ان گلیوں کے باسی ہیں اس لیے ان کرداروں کی نفسیات سے بھی بخوبی واقف نظر آتے ہیں۔ کردار چونکہ کہانی کے سفر کو لے کر ارتقائی منازل طے کرتے ہیں۔ کردار پلاٹ کی تنظیم و ترتیب میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور عاصم بٹ نے کرداروں کو فطرتی اور میکانکی انداز میں پیش کر کے کہانی کے بہاؤ

کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت کو منعکس کرنے کی مساعی جمیلہ سر انجام دی ہے۔ان کہانیوں کا تحقیقی سطح پر مطالعہ کرنا نفسیاتی تنقید کے ساتھ اتصال و انسلاک رکھتا ہے۔فلہذا عاصم بٹ کی کہانیاں آج کے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔

سفارشات:

ا۔ عاصم بٹ فکشن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اعلی درجے کے مترجم بھی ہیں۔ان کے دسیوں تراجم چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انہوں نے انگریزی زبان سے اردو اور اردو زبان سے انگریزی میں بھی تراجم کیے ہیں۔لہذا ان تراجم کا تقابل کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ عاصم بٹ کے ناولوں میں جس طرح لاہور شہر کو پیش کیا گیا ہے اسی طرح انہوں نے اپنے کئی افسانوں میں بھی لاہور شہر کی گلیوں میں چلتے پھرتے کرداروں کو پیش کیا ہے۔لہذا افسانوں اور ناولوں میں لاہور کی پیش کش کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے۔

۴۔ محمد عاصم بٹ مترجم اور فکشن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مدیر کی حیثیت سے لاہور شہر میں اپنی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ان کی صحافتی اور ادارتی خدمات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذات:

محمد عاصم بٹ، دائرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

محمد عاصم بٹ، بھید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

ثانوی ماخذات:

انور پاشا، ڈاکٹر، ہند و پاک میں اردو ناول تقابلی مطالعہ، پیش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

اے حمید، دیکھو شہر لاہور، القریش پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

اے حمید، لاہور کی باتیں کچھ نئی کچھ پرانی، خورشید مقبول پریس، لاہور، ۲۰۰۸ء

امر ناتھ، ماسٹر، لاہور کی سیر، انقلاب سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۲۶ء

انور عتیق صدیقی، ہندوستانی تاریخ و ثقافت اور فنون لطیفہ، نیشنل میوزیم، نئی دلی، 1993ء

بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء

بھولا ناتھ وارث، تاریخ شہر لہور، المطبعتہ العربیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء،

روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، دستاویز، لاہور، ۲۰۱۲ء،

سید عبد اللہ، ڈاکٹر، کلچر کا مسلئہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۷ء

سر سید احمد خاں آثار الصنادید، مرتبہ خلیق انجم، اردو اکادمی، لاہور، ۱۹۹۰ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۶ء

سید عبد الطیف، ڈاکٹر، تاریخ ثقافتِ ہند، انسٹی ٹیوٹ آف اندو رمڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز، حیدر آباد، ۱۹۶۷ء

سوم آنند، لاہور کی باتیں، مکتبہ جامعہ، نئی دلی، ۱۹۸۱ء

طاہر لاہوری، بلادالاؤلیاء لاہور، علی طاہر اینڈ سنز، لاہور، س ن

طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

عطاالحق قاسمی، غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۷ء

عبدالمجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، س ن

غفور احمد، نئی صدی نئے ناول، دارالنوادر، لاہور، ۲۰۱۴ء

فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، س ن

کنہیالال کپور، تاریخِ لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

مسعود حسین تارڑ، پیار کا پہلا شہر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۰

محمد دین فوق، لاہور عہدِ مغلیہ میں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

محمد عاصم بٹ، اشتہاری آدمی ور دوسری کہانیاں، فکشن ہاؤس لاہور، ۱۹۹۸ء

محمد عاصم بٹ، دستک، اے جے پرنٹرز، کراچی، ۲۰۰۹ء

محمد عاصم بٹ، کافکا کہانیاں، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء

محمد عاصم بٹ، بے موسم کا پھول، (جاپانی کہانیاں) مشعل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء

محمد عاصم بٹ، سو عظیم آدمی، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۹ء

محمد عاصم بٹ، توہمات کی دنیا (کارل سیگان کی کتاب کا ترجمہ)، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۰۲ء

محمد عاصم بٹ، محبت کے خطوط، از خلیل جبران، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۳ء

محمد عاصم بٹ، ناتمام، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

محمد عاصم بٹ، عبداللہ حسین: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر، اسلامی ثقافت، شیخ محمد عثمان اینڈ سنز، سری نگر، 2003ء،

نوبل انعام تک سفر، (ایرک کارل فیلڈ کے منتخب کلام کا ترجمہ اور سوانحی خاکہ)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد ۲۰۱۵ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، غفیف پرنٹرز، دہلی، ۲۰۱۴

یاسر جواد، لاہور عظمتوں کی کہانی گناہوں کی داستان، آر۔ آر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۶ء

The national culture .S.Abid Hussain ,national book trust,india edition 2003,p,03

رسائل و جرائد:

آمنہ مفتی، عاصم بٹ کا فن ناول نگاری، (مضمون) مطبوعہ، حلقہ اربابِ ذوق، لاہور، یکم ستمبر ۲۰۱۵ء،

انور سدید، ڈاکٹر، محمد عاصم بت کا پراسرار ناول دائرہ، (تبصرہ) مطبوعہ، ماہنامہ اوراق، جلد ۳۶، شمارہ ۲،۱، دسمبر ۲۰۰۲ء

ارشد معراج، دی ٹرائل اور دائرہ، تقابلی جائزہ (غیر مطبوعہ)

انسائکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز

جمیل احمد عدیل، دائرہ۔۔۔ ایک اہم ناول (غیر مطبوعہ)

حرا فاطمہ، بھید پر ایک نظر، (مضمون)، مطبوعہ، ادارہ عبارت، ۲۰۱۹ء،

ایم خالد فیاض، کلچر اور سویلزیشن کے اردو مبادلات و مفاہیم، (مضمون) مطبوعہ: دریافت، شمارہ ۵، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

رابعہ الرباء، دائرہ، (غیر مطبوعہ) تبصرہ، لاہور

رشید امجد، ڈاکٹر، ماہنامہ اوراق، لاہور، س ن

رفاقت حیات، محمد عاصم بٹ کا بھید، غیر مطبوعہ

زاہد مسعود، شخصی خاکہ "محمد عاصم بٹ" حلقہ اربابِ ذوق، لاہور، یکم ستمبر ۲۰۱۵ء

صدف نقوی، محمد عاصم بت کی ناول نگاری، (مضمون) مطبوعہ، ادبی ادارہ نقاط، فیصل آباد، ۲۰۱۳، ص ۵

عرفان جاوید، بلوریں دائرہ، مطبوعہ ادبی نقاط، فیصل آباد، 2004ء

عتیق انور راجہ، پنجاب کی ثقافت اور وزیر ثقافت، ایکسپریس، لاہور، ۲۰۲۱ء

گوہر مقبول، عاصم بٹ کی اوصاف سے گفتگو، اوصاف، اسلام آباد، س ن

مقالہ نگار کا محمد عاصم بٹ سے انٹرویو، بمقام اکادمی ادبیات، لاہور، ۱۸ اگست ۲۰۲۰ء

محمد حمید شاہد، عاصم بٹ کے فکشن کی تخلیقی فضا، ادبی تنازعات حرف اکادمی، س ن

محمد طفیل، لاہور نمبر، نقوش پریس، لاہور، ۱۹۸۶ء

محمد عامر رانا، عاصم بٹ جانتا ہے، مضمون (مطبوعہ)، اردو کالم، اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۱۹ء

وحید ارشد، بھید، ذاتی مخزونہ (غیر مطبوعہ) لاہور

یاسر جواد، آج کے مطبوعات، کراچی، س ن

ضمیمہ

۱۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کس شعبہ سے کیا؟

۲۔ آپ نے بطور لیکچرار نوکری سے استعفی کیوں دیا؟

۳۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا لیکن بعد میں شاعری ترک کیوں کر دی؟

۴۔ آپ کس ناول نگار سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے؟

۵۔ آپ نئے لکھنے والوں میں کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟

۶۔ ایک لکھاری کے لیے سب سے اہم عنصر کونسا ہوتا ہے؟

۷۔ موجودہ دور میں کونسی اصناف میں ترقی کا زیادہ رجحان ہے؟

۸۔ افسانہ نگاری میں سب سے زیادہ کونسا لکھاری پسند ہے؟

۹۔ آپ کے ناول اور افسانے لاہوری زندگی کے گرد کیوں گھومتے ہیں؟

۱۰۔ کیا ناول دائرہ کی کہانی آپ کی اپنی زندگی کا عکس ہے؟